قرآن کالج لاہور۔ اعلان داخلہ

برائے ایف اے (سیشن ۹۸۔۱۹۹۶ء)

- کالج ہذا میں دنیوی اور نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا بھی خاطر خواہ اہتمام کیا جاتا ہے۔
- کالج کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کے نتائج عموماً سو فیصد رہتے ہیں۔
- اس سال ایف۔ اے سال اول کے داخلے ان شاء اللہ جولائی کے اواخر تک مکمل کر لئے جائیں گے۔
- جو طلبہ اب تک مختلف بورڈوں کے ثانوی امتحان کے نتائج کی بنا پر کامیاب قرار دیئے جا چکے ہیں' وہ کالج کے دفتر سے رابطہ کر کے پراسپکٹس حاصل کر لیں اور ایف۔ اے میں داخلہ کے لئے فارم جمع کرا دیں' کالج میں نشستیں محدود ہیں۔
- داخلے اور انٹرویو کی آخری تاریخ کا اعلان مختلف بورڈوں کے نتائج آنے کے بعد جلد کر دیا جائے گا۔

المعلن : پرنسپل قرآن کالج' اناترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

فون : 5833638۔5833637

15-6-98

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

ماھنامہ

حکمتِ قرآن

لاھور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۵ | صفر المظفر ۱۴۱۷ھ جولائی ۱۹۹۶ء | شمارہ ۷

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور

۳۶- کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاھور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: داؤد منزل متصل شاہ بخاری۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاھور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرف اول

پچھلے دنوں قرآن کالج کے ایک طالب علم کو اللہ تعالیٰ نے وہ اعزاز بخشا ہے جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں' اور اپنے اس احساس میں ہم قارئین "حکمت قرآن" کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ "حکمت قرآن" اگر "تحریک رجوع الی القرآن" کا نقیب ہے تو قرآن کالج اسی تحریک کے فروغ کا ایک اہم ذریعہ۔

قریباً دو ماہ قبل "خانہ فرہنگ ایران" نے کل پاکستان بنیاد پر قرآن حکیم سے متعلق تین مختلف موضوعات اور عنوانات پر مشتمل انعامی مقابلوں کے ایک سلسلہ کا آغاز کیا۔ وہ تین عنوانات حسب ذیل ہیں : i) حفظ قرآن' ii) حسن قراءت اور iii) مفاہیم و معانی۔ قرآن کالج انتظامیہ کو بھی دعوت نامہ بھیجا گیا۔ ابتدائی مراحل میں لاہور کے مختلف دینی مدارس اور کالجوں کے طلبہ کا باہمی مقابلہ کرایا گیا۔ قرآن کالج کی طرف سے دو طلبہ کو ان مقابلوں میں شرکت کے لئے بھیجا گیا۔ حفظ قرآن کے شعبے میں قرآن کالج کے سال اول کے طالب علم حافظ منذر محمود نے مقابلے میں حصہ لیا اور تیسری پوزیشن حاصل کی۔ جبکہ مفاہیم و معانی قرآن کے شعبے میں سال سوم کے طالب علم نصراللہ نے پہلی پوزیشن حاصل کی۔ بعد ازاں عزیزم نصراللہ کو اس مقابلے کے فائنل راؤنڈ میں شرکت کے لئے اسلام آباد بلایا گیا۔ وہاں پاکستان کے تمام بڑے شہروں سے ان مقابلوں کے سیکنڈ راؤنڈ میں کامیاب ہونے والے طلبہ مقابلے میں شریک تھے۔ ان طلبہ میں چوٹی کے کالجوں کے طلبہ بھی شامل تھے اور نمایاں دینی مدارس اور علمی درسگاہوں کے طلبہ بھی شریک تھے۔ ہمارے لئے یہ اطلاع نہایت خوش کن تھی کہ اس فائنل مقابلے میں بھی عزیزم نصراللہ نے پہلا انعام حاصل کیا۔ مفاہیم و معانی قرآن کے مقابلے میں قرآن کالج کے طالب علم کا اول آنا ہمارے لئے اس اعتبار سے بھی حوصلہ افزائی اور اطمینان کا باعث ہے کہ قرآن کالج میں اصل زور عربی زبان سیکھ کر قرآن حکیم کا فہم حاصل کرنے پر دیا جاتا ہے اور

(باقی صفحہ ۶ پر)

سلسلۂ تقاریر "تعارف الکتاب"
ڈاکٹر اسرار احمد

وَمَآ اُبَرِّئُ ۱۳

نحمده ونصلی علیٰ رسوله الکریم

أعوذُ باللهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ   بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ o

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ

الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ o (یوسف: ۵۳، ۵۴)

قرآن مجید کا تیرھواں پارہ 'وَمَآ اُبَرِّئُ' کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے اور اسی نام سے موسوم ہے۔ اس میں اولاً سورۂ یوسف کا بقیہ نصف شامل ہے اور اس کے بعد دو نسبتاً چھوٹی سورتیں یعنی سورۃ الرعد اور سورۂ ابراہیم پوری پوری شامل ہیں اور آخر میں ایک آیت سورۃ الحجر کی شامل ہے۔ سورۂ یوسف کا جو حصہ اس پارے میں آیا ہے اس کا آغاز ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اس ظہور سے کہ جس کے نتیجے میں حضرت یوسف علیہ السلام مصر کی جیل سے نکل کر حکومتِ مصر میں ایک انتہائی بااثر عہدے پر فائز ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں مصر میں تمکن اور غلبہ عطا فرمایا اور اس کے ساتھ ہی بادشاہ کا وہ خواب جس کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ بتائی تھی کہ سات سال تو بڑی خوشحالی کے آئیں گے اور اس کے بعد سات سال ایک بڑا شدید قحط پڑنے والا ہے۔ تو جب اس قحط کا زمانہ آیا اور یہ قحط صرف مصر میں نہیں تھا بلکہ اس کے اطراف و جوانب میں بھی تھا، چنانچہ اس کے اثرات سرزمینِ فلسطین تک بھی پہنچے جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بقیہ گیارہ بیٹے سکونت پذیر تھے۔ قحط کے ہاتھوں مجبور ہو کر حضرت یعقوب علیہ السلام کے دس بیٹے یعنی حضرت یوسفؑ کے سوتیلے بھائی مصر میں آ گئے تاکہ غلہ حاصل کر سکیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کو پہچان لیا۔ لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ عزیزِ مصر کی صورت میں ہمارا وہی بھائی تخت پر بیٹھا ہے جسے ہم نے اپنے ہاتھوں ایک اندھے کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ غلہ لینے کے لیے آئے اور اس وقت ان کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام

نے اصرار کر کے اپنے چھوٹے بھائی بنیامین کو بھی بلا لیا۔

پھر وہ وقت بھی آیا جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے پاس غلہ کی قیمت ادا کرنے کے لیے کچھ نہ تھا اور انہوں نے انتہائی عاجزی کے ساتھ خیرات کی استدعا کی۔ اس پر حضرت یوسف علیہ السلام سے مزید ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے اپنے آپ کو اپنے بھائیوں پر ظاہر کر دیا۔ یہ وہ وقت ہے جب کوئی دنیا دار انسان یا جس کے ظرف میں کسی اعتبار سے بھی کمی ہو وہ اپنے بھائیوں کو یاد دلاتا ہے کہ تم نے مجھ پر کیا مظالم ڈھائے تھے، لیکن اللہ کے نبیوں اور رسولوں کا معاملہ بالکل جدا ہے۔ جب حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کچھ معذرت پیش کرنے کی کوشش کی تو حضرت یوسفؑ نے فرمایا: لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ (یوسف:۹۲) "آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائے"۔ یاد رہنا چاہیے یہی وہ الفاظ تھے جو تقریباً ڈیڑھ ہزار سال بعد مکے کی سرزمین میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اُس وقت نکلے جب آپؐ فاتح کی حیثیت سے مکے میں داخل ہوئے تھے۔ وہ لوگ آپ کے سامنے مفتوحین کی طرح کھڑے تھے جنہوں نے آپؐ کو مکے سے نکلنے پر مجبور کیا تھا اور اس کے بعد بھی مسلسل آٹھ برس تک مدینے میں چین سے بیٹھنے نہ دیا تھا۔ آنحضورؐ نے اس وقت فرمایا کہ میں بھی آج تم سے وہی بات کہوں گا جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے کہی تھی: لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ یعنی آج میں تمہیں ملامت کا کوئی لفظ بھی نہیں کہنا چاہتا، جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے بعد اپنے بھائیوں سے کہہ کر اپنے والدین کو بھی مصر بلا لیا۔ ان کے والدین اور سارے گیارہ بھائی تعظیماً ان کے سامنے جب سجدے میں گر گئے تو گویا کہ حضرت یوسفؑ کا وہ خواب جو کہ انہوں نے بچپن میں دیکھا تھا، واقعہ بن کر سامنے آگیا۔

اس سورۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے کہ ظاہری حالات سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ انتہائی مایوس کن حالات میں بھی کامیابی کی صورتیں پیدا فرما سکتی ہے۔ آخر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دل جوئی میں فرمایا گیا کہ اے نبیؐ آپ ان کفار کے انکار سے رنجیدہ نہ ہوں۔ وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ۔ (یوسف:۱۰۳) "آپ کو ان کے ایمان کی خواہ کتنی ہی خواہش و تمنا ہو ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں"۔ وہ اپنے کفر اور اپنے اعراض و انکار پر اڑ گئے ہیں۔ ایک اور بڑی عظیم حقیقت جو بیان فرمائی اس سورۂ مبارکہ کے اختتام پر وہ یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کا معاملہ عجیب ہے کہ وہ اللہ کو مانتے تو ہیں لیکن ان کی

اکثریت اس کے ساتھ کسی نہ کسی نوع کا شرک بھی کرتی ہے۔ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ (یوسف: ۱۰۶) "لوگوں کی اکثریت اللہ کو مانتی تو ہے لیکن اُس کے ساتھ کسی نہ کسی نوع کا شرک ضرور کرتی ہے"۔ ساتھ ہی حضورؐ کو حکم دیا گیا: قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (یوسف: ۱۰۸) لوگو! یہ میرا راستہ (توحید کا راستہ ہے) خدا کی بندگی اور خدائے واحد کی پرستش کا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف تمہیں بلا رہا ہوں اور علیٰ وجہ البصیرت بلا رہا ہوں اور میں بھی بلا رہا ہوں اور وہ بھی جو میری پیروی کر رہے ہیں، جیسے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

سورۂ یوسف کے بعد قرآن حکیم میں دو نسبتاً چھوٹی سورتیں ہیں، یعنی سورۃ الرعد اور سورۃ ابراہیم۔ سورۃ الرعد میں سورۃ یونس اور سورۃ الانعام کی طرح آفاق و انفس کے دلائل سے اور اللہ تعالیٰ کی ظاہری اور معنوی نعمتوں کے حوالے سے توحید کی دعوت دی گئی ہے، آخرت کا اثبات کیا گیا ہے اور نبوتِ محمدیؐ کا اثبات کیا گیا ہے۔ ایک عجیب پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا کہ یہ لوگ آخرت پر تعجب کرتے ہیں کہ جب ہم سب مر جائیں گے اور مٹی ہو کر مٹی میں مل جائیں گے تو ہمیں اٹھا لیا جائے گا؟ فرمایا: وَإِن تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ..... (الرعد: ۵) یعنی کہہ دو اے مخالف اگر تمہیں تعجب کرنا ہی ہے تو قابلِ تعجب ان کی بات ہے کہ وہ اللہ کی قدرت سے اسے بعید سمجھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے اگر تو انسان اللہ ہی کا انکار کر دے تو وہ بات دوسری ہے لیکن اگر اللہ کو مان لے اور یہ تسلیم کر لے کہ وہ علیٰ کُلِّ شَیْءٍ قدیر ہے تو پھر آخرت پر اس کا تعجب کرنا یقیناً قابلِ تعجب ہے۔ سورۂ ابراہیم میں کچھ دیگر انبیاء اور رسل کا بھی ذکر ہے لیکن قدرے تفصیل سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے۔

توحید اور ایمان باللہ کے سلسلے میں اس سورۂ مبارکہ میں ایک جگہ بڑے عجیب الفاظ وارد ہوئے ہیں: أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (ابراہیم: ۱۰) "لوگو! کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک لاحق ہو سکتا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والا ہے"۔ آخرت کے احوال کے ضمن میں فرمایا گیا کہ وہ شیطان لعین جس کا تم اتباع کر رہے ہو، جس کی پیروی کر رہے ہو، جس کے اغواء اضلال کی وجہ سے تم گمراہیوں میں بھٹک رہے ہو، قیامت کے دن وہ تم سے اظہارِ برأت کرے گا، اعلانِ لاتعلقی کرے گا، اور یہ کہے گا: فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنفُسَكُم (ابراہیم: ۲۲) یعنی مجھے ملامت نہ کرو، ملامت کرو اپنے آپ کو، اپنے نفس کو، اس لیے کہ میں نے تو تمہیں صرف گناہ

کی دعوت دی تھی، اس دعوت کو قبول کرنا یا نہ کرنا تو تمہارے اختیار میں تھا۔ مجھے تم پر کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ تم نے اگر گناہ کی دعوت پر لبیک کہا، تو اصل مجرم تم خود ہو، اب تمہیں بھی اپنے کیے کی سزا بھگتنی ہوگی، اور مجھے بھی اپنے اعمال کی سزا بھگتنا ہوگی مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ "نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو دعا اس سورۂ مبارکہ میں آئی ہے وہ بہت عظیم ہے:

رَبَّنَآ اِنِّيٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔

(ابراہیم: ۳۷) یعنی "اے میرے رب! میں نے اپنی اولاد کا ایک حصہ اپنی نسل کی ایک شاخ اس وادی میں آباد کر دی ہے کہ جس میں کوئی زراعت نہیں ہے کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی، تیرے گھر کے پاس تاکہ وہ نماز کا نظام قائم کریں"۔ یہ ہے درحقیقت خانہ کعبہ کی تعمیر کا اصل مقصد۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

بقیہ : حرفِ اول

فروعی نوعیت کی بحثوں اور منطق و فلسفہ کے ادق مباحث میں طلبہ کو الجھانے کی بجائے قرآن کے اصل پیغام اور اس کی فکری و نظری اور علمی و عملی رہنمائی کو اخذ کرنے کی جانب زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ (واضح رہے کہ ہم قرآن کے ساتھ حدیث و سنت کی اہمیت کو کسی ادنیٰ درجے میں گھٹانے کے بھی روادار نہیں ہیں بلکہ اسے قرآن حکیم ہی کی تشریح و تفسیر گردانتے اور اس کی اہمیت کے شدت کے ساتھ قائل و معترف ہیں۔) مفاہیم و معانی قرآن کے اس مقابلے میں قرآن کالج کے ایک طالب کا اول آنا اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ قرآن کالج کے قیام سے جو مقاصد ہمارے پیش نظر تھے، بحمد اللہ ان کے حصول میں ہمیں بہت حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ان مقابلوں میں قرآن کالج کے طلبہ کی شرکت کا ایک اضافی فائدہ یہ بھی نظر آیا کہ ہمارا یہ کالج جس کا تعارف اب تک نہایت محدود حلقے میں ہے، اس ذریعے سے ایک وسیع تر حلقے میں متعارف ہوا ہے۔ فللہ الحمد والمنہ۔OO

باب اول

ایمان کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

مرتّب : مولانا عبدالرحمٰن شبیر بن نور

شرعی اصطلاحات کی بنیاد

قرآن حکیم عربی زبان میں ہے اور نبی اکرم ﷺ کی زبان بھی عربی تھی۔ چنانچہ قرآن حکیم کی بنیادی اصطلاحات کو سمجھنے اور قرآن و حدیث سے براہ راست استفادے یا بالفاظِ دیگر دین سیکھنے کے لئے عربی زبان جاننا اشد ضروری ہے۔

عربی زبان میں ہر لفظ کا ایک مادہ (Root) اور بنیادی مفہوم ہوتا ہے۔ لیکن جب کوئی لفظ اصطلاح کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو پھر اصل حجت لغت نہیں بلکہ دینی اصطلاح ہوتی ہے اور اس کا مفہوم قرآن و حدیث سے متعین ہو گا۔ مثلاً لفظ "صلاۃ" کا لغوی مفہوم ہے آگ تاپنا اور اِقدام الی الشّیء۔ محض اس مفہوم کو سامنے رکھ کر صلاۃ کے معنی نکالنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا صلاۃ کا شرعی مفہوم وہی ہو گا جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ سے ثابت ہو گا۔ اسی طرح لفظ "صوم" کے لغوی معنی ہیں "رک جانا"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کس چیز سے رک جانا؟ کب رک جانا؟ کس صورت میں رک جانا؟ اور کس وقت سے لے کر کس وقت تک رکے رہنا؟ یہ تمام مفاہیم و معانی قرآن حکیم اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کی راہنمائی میں معین ہوں گے۔ معلوم یہ ہوا کہ دینی اصطلاحات میں اصل بنیاد لغوی معنی نہیں بلکہ شریعت کے مقرر کردہ معانی و مفاہیم ہیں۔

لغوی معنی اور شرعی اصطلاح میں باہمی ربط

قرآن حکیم اور سنتِ رسول ﷺ میں بیان ہونے والی اصطلاحات کا اپنے لغوی

معنی کے ساتھ کسی نہ کسی درجے میں کوئی ربط اور کوئی نہ کوئی معنوی تعلق بھی برقرار رہتا ہے۔ اس ربط و تعلق پر غور کرنے سے ان اصطلاحات کی روح اور ان کے حقیقی مفہوم پر ایک باطنی بصیرت ضرور حاصل ہوتی ہے کہ اس کا اصل مفہوم کیا ہے۔

لفظ صلاۃ کا ایک مفہوم ہے اِقدام اِلَی الشَّیء۔ تو یہ معنی "اِنِّی وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِی فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیفًا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ" (میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف کرلیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور میں بالکل یکسو ہوں اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں) {۱} والی دعا میں موجود ہے جو کہ ابتداءِ نماز میں پڑھنی مسنون و ماثور ہے۔ اسی طرح آگ تاپنے کا مفہوم ذکرِ الٰہی کے ذریعے اپنی روح کو گرم کرنے میں موجود ہے۔ گویا کہ یہ تمام معانی لفظ کی روح میں شامل ہیں۔ زکاۃ کی روح بھی یہی ہے کہ اپنے نفس کا تزکیہ کرنا' مال کی محبت سے دل کو پاک صاف کرنا۔ چنانچہ ایسا بھی نہیں ہے کہ کلمے کی لغوی اساس کا شرعی اصطلاح سے کوئی تعلق ہی نہ ہو' بلکہ ان اصطلاحات کی جو باطنی روح ہے وہ لغوی اصل سے اجاگر ہوتی ہے اور مزید واضح ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ بات طے ہے کہ لغوی معنی کو اصطلاحی معنی پر حاکم نہیں کیا جا سکتا۔ فیصلہ کن بات وہی ہو گی جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ سے اصطلاح کا مفہوم معین کرنے کے لئے ثابت ہو۔

لفظ ایمان کی لغوی تحقیق

عربی زبان کے ننانوے فیصد سے زائد الفاظ ایسے ہیں جن کا ایک سہ حرفی مادہ ہوتا ہے اور اسی مادے سے الفاظ بنتے چلے جاتے ہیں۔ سادہ ترین مثال ہے "علم"۔ اس سے بنا "عالم" (یعنی علم رکھنے والا' جاننے والا) "معلوم" (وہ چیز جو کسی کے علم میں ہے) "علّامہ" (بہت زیادہ علم رکھنے والا) "علامت" (پہچان) "استعلام" (معلومات حاصل کرنا)

{۱} صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین' باب الدعاء فی صلاۃ اللیل وقیامہ' حدیث نمبر ۷۷۱ و سنن الترمذی حدیث نمبر ۳۴۱ و مابعدہ و سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۷۶۰

"متعلّم" (علم سیکھنے والا) "معلّم" (علم دینے والا)۔ اس طرح "ع ل م" سے الفاظ بنتے چلے جائیں گے اور اوزان کے مطابق مختلف سانچوں میں ڈھلتے چلے جائیں گے' لیکن تمام الفاظ کا اپنے اصل مادے یعنی "علم" سے تعلق برقرار رہے گا۔ گویا کہ "اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ"۔ اس اصول کو سامنے رکھ کر غور کریں تو ایمان کا مادہ "امن" ہے : "ا م ن"۔ امن اور ایمان میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ وَكَيْفَ اَخَافُ مَا اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا ۚ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ ﴾

(الانعام : ۸۱-۸۲)

"اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جبکہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لئے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی۔ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ امن و اطمینان کا مستحق ہے' بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔ حقیقت میں تو امن انہی کے لئے ہے اور راہ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا"۔

ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنی قوم کے ساتھ جھگڑا ہو رہا تھا اور لوگ انہیں ڈرا رہے تھے کہ تم نے تمام معبودوں کا انکار کر دیا ہے' تمہاری تو شامت آ کر رہے گی' تو انہوں نے جواب میں فرمایا : ﴿ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ کہ اِس وقت میدان میں دو فریق ہیں' ایک موحّدین کا اور دوسرا مشرکین کا' ان دونوں میں سے کون زیادہ امن کا مستحق ہے؟ تم خود غور کرو' سوچو' ایک ہزار معبودوں کو پوجنے والے یا ایک خدائے بزرگ و برتر کو ماننے والے۔ ساتھ ہی اس کا جواب بھی دے دیا گیا کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا

اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ ﴾ گویا کہ امن کی منزل ایمان کی شاہراہ پر چل کر ملتی ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ میں امن اور ایمان کا تعلق بہت واضح ہو کر سامنے آگیا ہے۔

قرآن حکیم میں لفظ "الامن" تین ہی بار استعمال ہوا ہے۔ دو مرتبہ تو ان ہی آیات میں آگیا ہے اور ایک مرتبہ سورۃ النساء آیت نمبر ۸۳ میں آیا ہے' جہاں لفظ "خوف" کے مقابلے میں "امن" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ فرمایا :

﴿وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ﴾

(النساء : ۸۲)

"یہ لوگ جہاں کوئی امن کی یا خوف کی خبر سن پاتے ہیں اسے لے کر پھیلا دیتے ہیں"۔

منافقین کی روش پر تبصرہ کیا گیا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ کہیں سے خوف یا امن کی خبر ان تک پہنچی تو ذمہ دار لوگوں تک پہنچانے کی بجائے اسے فوراً عام لوگوں میں نشر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ خوفناک خبر سے سنسنی تو پیدا ہو گی۔ ایک ہی آیت میں امن اور خوف کے بالمقابل استعمال سے لفظ "امن" کا مفہوم واضح ہو گیا کہ یہ خوف کی ضد ہے' کیونکہ قانون ہے :

"تُعْرَفُ الاشیاءُ بِاَضدادِھا" (اشیاء کو ان کی اضداد کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے)

ایمان کی گہرائی اور گیرائی جب اس درجے کو پہنچ جائے کہ انسان اس کیفیت کو پالے "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ" {۲} "کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ اسے سامنے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے تو یہ یقین ضرور رہے کہ وہ ذات تم کو دیکھ رہی ہے" تو یہ مقام احسان ہے' جہاں پہنچ کر یقین کی کیفیت اتنی گہری ہو جاتی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ "ولایتِ باہمی" کے رشتے میں جڑ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس انعام کا مستحق ہو جاتا ہے جس کا ذکر

{۲} صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب نمبر ۳۶ سوال جبریل النبی ﷺ عن الایمان' حدیث نمبر ۵۰ و صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان الایمان والاسلام حدیث نمبر ۹

سورۃ یونس کی آیات ۶۲ اور ۶۳ میں ہے :

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ○﴾

"سنو' جو اللہ کے دوست ہیں' جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ کا راستہ اختیار کیا ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔"

نیک اعمال کے حوالے سے یہ مضمون قرآن حکیم میں تیرہ دفعہ بیان ہوا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ خوف و حزن سے نجات پانا ہی "امن" ہے اور یہی امن کا حقیقی اور اصلی مفہوم ہے۔

لفظ امن کی شناخیں اور ان کا مفہوم

"اَمِنَ 'یَاْمَنُ 'اَمْنًا وَاَمَنَۃً" کے معنی ہیں "امن میں ہونا"۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن حکیم میں بار بار آیا ہے {۳}۔ اَمِنَ سے اسم فاعل بنتا ہے آمِنٌ {۴} جو کہ خود امن میں ہو۔ اسی سے لفظ "مَاْمُوْن" بنتا ہے جو کہ اسم مفعول ہے 'یعنی جس سے کوئی اندیشہ نہ ہو' جس سے امن لے لیا گیا ہو' جسے زیر کر لیا گیا ہو' جس سے کوئی اندیشہ نہ رہے کہ وہ

{۳} یہ لفظ صرف سورت الملک میں دو مرتبہ استعمال ہوا ہے' فرمایا : ﴿ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا ھِیَ تَمُوْرُ' اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا﴾ (الملک : ۱۶-۱۷) "کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تمہیں زمین میں دھنسا دے اور یکایک یہ زمین جھکولے کھانے لگے' کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے"۔ اسی طرح کی پتھراؤ کرنے والی ہوا قوم عاد پر آ چکی ہے۔ سورۃ الاعراف میں یہ لفظ بیان ہوا ہے : ﴿اَفَاَمِنُوْا مَکْرَ اللّٰہِ فَلَا یَاْمَنُ مَکْرَ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ (الاعراف : ۹۹) "کیا اللہ کی چالوں سے وہ اپنے آپ کو مامون سمجھتے ہیں؟ (محفوظ سمجھتے ہیں؟ امن میں سمجھتے ہیں؟) تو جان لو کہ اللہ کی چال سے امن میں ہونے والا وہی ہو سکتا ہے جو کہ خسارہ پانے والا ہو"۔ مذکورہ بالا آیات کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اَمِنَ 'یَاْمَنُ کا مطلب ہے امن میں ہونا۔

{۴} قرآن حکیم میں یہ لفظ "آمِنًا" کی شکل میں چھ مرتبہ آیا ہے "آمِنَۃً" کی شکل میں ایک ◄

آپ کو کوئی گزند پہنچا سکتا ہو۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن حکیم میں صرف ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ فرمایا :

﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ۝﴾ (المعارج : ۲۸)

"یقیناً ان کے رب کا عذاب ایسی شے نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف اور نڈر ہو جائے"۔

لفظ امن سے اسم ظرف آتا ہے "مَاْمَن"{۵} یعنی امن کی جگہ۔ اسی لفظ سے صفتِ مشبّہ ہوگی : "اَمِین"۔ واضح رہے کہ صفت مشبہ اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں کا معنی دیتی ہے۔ چنانچہ جو خود امن میں ہو اسے بھی "امین" کہیں گے اور جس شخص سے دوسرے لوگ امن میں ہوں وہ بھی "امین" ہے۔ لفظ "امین" دونوں معنی کے اعتبار سے قرآن مجید میں چودہ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

فعل کے معنی پر صلہ کے اثرات

ہر زبان میں فعل (Verb) کے ساتھ صلہ (Preposition) کی تبدیلی کے ساتھ ہی

⬅ مرتبہ "آمِنُون" دو مرتبہ "آمِنِین" آٹھ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ الفتح میں فرمایا گیا : اے مسلمانو! گھبراؤ نہیں، اس وقت صلح حدیبیہ ہو جانے کے باعث تمہیں عمرے کے بغیر ہی یہاں سے لوٹنا پڑ رہا ہے لیکن وہ وقت ضرور آئے گا جب ﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ.....﴾ (الفتح : ۲۷) "ان شاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے، اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے"۔ "آمِنِین" یعنی کوئی خوف، کھٹکا، بے چینی، اور اندیشہ نہ ہوگا۔ (ماخوذ)

{۵} سورۃ التوبہ میں فرمایا گیا کہ بس اب چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے : ﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ.....﴾ (التوبہ : ۵) "جب یہ چار ماہ ختم ہو جائیں تو تم جہاں کہیں مشرکوں کو پاؤ قتل کر دو"۔ آگے چل کر استثنائی صورت بیان کرتے ہوئے فرمایا : ﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ﴾ (التوبہ : ۶) "اگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے امن کا طالب ہو تو آپ اسے پناہ دے دیجئے تاکہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دیں"۔ معلوم ہوا کہ "مَاْمَن" کے معنی ہیں امن کی جگہ۔ (ماخوذ)

معنی بدل جاتے ہیں۔ to give کا مفہوم کچھ اور ہے اور to give in کا مفہوم کچھ اور ہی بن جاتا ہے۔ یہاں یہ لفظ محاورے کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ نیز to give up کے معنی کچھ اور ہی بن گئے۔ صرف صلہ (Preposition) کے بدلنے سے معانی میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو رہا ہے۔ ایک درجے میں یہ بات عربی زبان کے ساتھ بھی ہے۔ صلہ بدلے گا تو مفہوم بھی بدلے گا۔ لیکن عربی بڑی Mathematical زبان ہے۔ اس میں صلہ کی تبدیلی کے ساتھ بھی جڑ سے تعلق ختم نہیں ہوتا۔ چنانچہ "اَمِنَ" کے بعد اگر "بِ" یا "عَلٰی" کا صلہ آجائے تو معنی ہوں گے : کسی چیز پر کسی دوسرے کو امین بنانا۔ آپ نے کسی کے پاس امانت رکھوائی تو کہیں گے "اَمِنَ بِہٖ" اور "اَمِنَہٗ بِشَیْءٍ" یعنی "اس نے امین بنایا اس کو ایک چیز کے بارے میں"۔ اب غور کریں کہ صلہ آنے کے بعد بھی معنی کا اپنی اصل سے تعلق برقرار رہا کیونکہ امین اسی کو بنایا جاتا ہے جس کے بارے میں خیانت کا اندیشہ نہ ہو۔ چنانچہ "اَمِنَ فُلَانًا بِفُلَانٍ" یا "عَلٰی فُلَانٍ" کا مفہوم ہوگا : "کسی کو امین بنانا کسی پر' یا کسی کے بارے میں اعتماد کرنا۔" مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ... ﴾

(آل عمران : ۷۵)

"اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ ڈھیروں سونے پر بھی اگر انہیں امین بنا دو گے تو وہ تمہیں واپس کر دیں گے' لیکن ان میں ایسے بھی ہیں کہ ایک دینار بھی اگر امانت رکھوا دو گے تو واپس نہیں کریں گے..."

تو معلوم ہوا کہ "اَمِنَ فلانًا بفلانٍ" کا مفہوم ہے کسی کو کسی چیز پر امین بنانا۔ اسی معنی میں "عَلٰی" کا صلہ بھی آتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اپنے بیٹوں سے گفتگو کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے' فرمایا : ﴿ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ﴾ (یوسف : ۶۴) یعنی "کیا میں تمہیں امین سمجھوں اس (بن یامین) کے بارے میں' اسی طرح جس طرح میں نے تمہیں امین بنایا تھا

اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں"۔

لفظ "اَمِن" سے جب باب افتعال بنتا ہے تو اس کا معنیٰ بھی امین بنانا ہی ہے۔ یعنی "اِئْتَمَنَ، یَأْتَمِنُ" بمعنی امین بنانا اور بھروسہ کرنا۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ صرف ایک دفعہ استعمال ہوا ہے۔ فرمایا: ﴿فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ﴾ (البقرۃ: ۲۸۳) "اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسہ کرکے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے تو پھر جس کو امین بنایا گیا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ امانت واپس کردے"۔

لفظ ایمان کی لغوی اور شرعی تعریف

لفظ "اَمِن" کو باب اِفعال میں لے جائیں تو مصدر بنے گا: "ایمان"۔ یعنی کسی کو امن دینا۔ تو لفظ ایمان کا ترجمہ ہوا "امن دینا"۔ اسی سے اسم فاعل بنتا ہے: "مُؤمِن" یعنی امن دینے والا۔ اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا نام ہے "المُؤمِن"۔ سورۃ الحشر میں فرمایا گیا ہے: ﴿اَلْمُؤْمِنُ، اَلْمُهَيْمِنُ، اَلْعَزِيْزُ، اَلْجَبَّارُ، اَلْمُتَكَبِّرُ﴾ (امن دینے والا، نگہبان، سب پر غالب، اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور بڑا ہو کر رہنے والا)۔ تو معلوم ہوا کہ اَمِنَ۔ یَأْمَنُ۔ اَمْنًا کا مفہوم ہے: خود امن میں ہونا، اور آمَنَ۔ یُؤْمِنُ اِیمَانًا کے معنی ہیں: دوسرے کو امن فراہم کرنا۔

لفظ ایمان کے بعد جب "بِ" یا "لِ" کا صلہ آئے گا تو معنی ہوگا کسی کی تصدیق کرنا۔ مثلاً کسی نے آکر کوئی خبر دی یا دعویٰ کیا تو جواب کی دو ہی شکلیں ہوں گی: تصدیق یا تردید۔ تصدیق کردی تو امن رہا اور اگر تردید کردی تو جھگڑا شروع، جھگڑا تھوڑا ہو یا زیادہ، زبانی کلامی ہو یا ہاتھاپائی ہو یا قتال اور خون ریزی، بہرحال جھگڑا شروع ہوگیا ہے۔ چنانچہ "آمَنَ بِہٖ" اور "آمَنَ لَہٗ" کے معنی ہیں کسی کی تصدیق کرنا۔ تصدیق کرنے میں امن کے ساتھ تعلق برقرار رہا اور تصدیق کرنے کا معنی دعویٰ کرنے والے کو امن دینا ہے۔ قرآن حکیم میں "ل" کے صلے کے ساتھ "آمَنَ لَہٗ" کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں سرسری طور پر کسی کی بات کو مان لینا۔ اگرچہ یہاں ایک استثناء موجود ہے:

﴿فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ﴾ (العنکبوت : ۲۶) یعنی حضرت لوط بھی حضرت ابراہیم علیہما السلام پر ایمان لے آئے۔ یہاں ایمان لانا سرسری معنی میں نہیں ہے۔

عام طور پر لفظ "ایمان" جب "ل" کے صلے کے ساتھ آئے تو اس میں وہ گہرائی اور وثوق والی بات نہیں ہوا کرتی، لیکن جب "بِ" کے صلے کے ساتھ آئے تو اس کے معنی میں بڑے وثوق اور بھرپور اعتماد کے ساتھ کسی بات کو مان لینا اور کسی کے دعوے کی تصدیق کرنا شامل ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے لفظ ایمان کو جب اصطلاحی معنوں میں بیان کیا ہے تو "بِ" کے صلے کے ساتھ ذکر کیا ہے، فرمایا : ﴿یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ --- ﴿الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ﴾ --- ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ --- ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (یہ سب آیات سورۃ البقرۃ کی ہیں) --- ایمان مجمل کے الفاظ ہیں : آمنتُ باللہ کما ھُو باسماءِہٖ وصفاتہٖ..... اور ایمان مفصل کے الفاظ ہیں : آمنتُ باللہ وملٰئکتہٖ.... گویا چند استثناءات کے علاوہ جب لفظ ایمان "بِ" کے صلے کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہیں تصدیق کرنا۔

اصطلاحی اور شرعی تعریف

جب ایمان نام ہے تصدیق کا، تو تصدیق ہوگی نبی کی، اس کے دعویٰ نبوت کی، اور اُس دعوے کی بنیاد پر نبی جو کچھ پیش کرے اس کی۔ یعنی "تصدیقُ بما جاءَ بہِ النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم"۔ علامہ ابن حجر العسقلانی فرماتے ہیں : "الایمان لغۃً التصدیق وشرعًا تصدیقُ الرسولِ فیما جاء بہٖ عن ربہٖ" {۶} یعنی "لغوی اعتبار سے ایمان نام ہے صرف تصدیق کا اور شرعًا : رسول جو کچھ اپنے رب کی طرف سے لائے اس کی تصدیق کا"۔

نبی اور رسول کی لائی ہوئی تعلیمات مختلف امور پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ

{۶} فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب الایمان، ج۱، ص۶۰، طبع دارالریان

غیبی امور ہوتے ہیں' مثلاً اللہ پر ایمان' فرشتوں پر ایمان' آخرت پر ایمان۔ اسی طرح ان تعلیمات میں سے بعض کی نوعیت احکام کی ہوتی ہے۔ یہ اوامر ہیں' یہ نواہی ہیں' یہ فرائض ہیں' یہ حلال ہیں اور یہ حرام ہیں۔ نبی و رسول سابقہ امتوں کے حالات اور قصص بھی بیان کرتے ہیں' ان کی تصدیق بھی شامل ایمان ہوگی۔ لیکن معروف معنی میں لفظ ایمان کا اطلاق صرف ان غیبی امور کی تصدیق پر ہوتا ہے جن کو جاننے کا ہمارے پاس خود اپنا کوئی ذاتی ذریعہ نہ ہو' مثلاً موت کے بعد کیا حالات پیش آنے والے ہیں؟ فرشتوں کو ہم نہیں دیکھ سکتے اور اسی طرح کے دوسرے غیبی امور ہماری دسترس سے باہر ہیں' اسی لئے سورۃ البقرۃ کے بالکل شروع میں ایمان کے لئے جو پہلا لفظ آیا ہے وہ ہے ﴿یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ یعنی "وہ (متقی لوگ) غیبی امور پر ایمان لاتے ہیں"۔ تو معلوم ہوا کہ ایمان کا اصلاً اور اصطلاحاً مفہوم "غیبی امور کو تسلیم کرنا" ہے۔

واضح رہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے پہلے نبی تھے اور حضرت محمد ﷺ آخری نبی۔ ان کے درمیان ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اور تین سو پندرہ رسول تشریف لائے۔ ان رسولوں میں سے پانچ رسولوں کو "اولوالعزم" کا لقب ملا ہے۔ انبیاء و رسل علیہم الصلاۃ والسلام کی تعلیمات دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ایک حصہ احکام شریعت کہلاتا ہے جو ہر علاقے اور زمانے کے اعتبار سے بدلتا رہا ہے۔ مثلاً نماز کی صورتیں بدلتی رہی ہیں' روزے کے احکام بدلتے رہے ہیں۔ البتہ دین کا دوسرا حصہ "ایمانیات" کہلاتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی' بال برابر فرق نہیں آیا۔ حضرت آدم' حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد علیہم الصلاۃ والسلام سب کی ایمانیات کی تعلیم ایک ہی رہی ہے۔ یہ چونکہ انبیاء کی تعلیم کا وہ حصہ ہے جو امور غیبی سے متعلق ہے' لہٰذا اس میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ (جاری ہے)

۵

قرآن عزیز کی جلالتِ شان

اور حضور ﷺ کا فطری تأثر

مولانا سید اخلاق حسین قاسمی دہلوی

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۝﴾ (الحشر : ۲۱)

"یہ قرآن عزیز اگر ہم نے کسی پہاڑ پر اتار دیا ہوتا تو (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) تم دیکھتے کہ وہ (پہاڑ) اللہ تعالیٰ کی ہیبت سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں"۔

اس آیت کریمہ کے اسلوب پر غور کیجئے۔ ذکر قرآن کریم کے نازل کرنے کا ہے اور اس کے نزول سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے خوف کا اثر بیان کیا جا رہا ہے۔ یعنی "مِنْ خَشْيَةِ القرآن" کی جگہ "مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ" کہا گیا ہے۔ اسلوب کی یہ تبدیلی بتا رہی ہے کہ قرآن عزیز اللہ کا کلام ہے اور کلام متکلم یعنی اللہ کی صفت ہے اور صفت میں موصوف کی جلالتِ شان کی جلوہ گری ہے۔ ذاتِ حق تعالیٰ کی یہی جلالتِ شان ہے کہ پہاڑ جیسی عظیم مادی مخلوق اس کے تصور سے پھٹ جاتی اگر یہ کلام اس پر نازل کیا جاتا۔

علامہ ابن کثیر نے یہ شرط لگائی کہ اگر پہاڑوں میں فہم و شعور ہوتا تو ایسا ہوتا : "لو فهم هذا القران فتدبر ما فيه لخشع وتصدع من خوف الله عزوجل"----- اسی رائے کی پیروی اردو مفسرین نے اختیار کی---- لیکن سورۃ النور (آیت ۴۱) اور سورۃ الاسراء (آیت ۴۴) سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام مخلوق میں اپنے

خالق و مالک کی عظمت و جلالت کا فطری طور پر شعور موجود ہے اور ساری مخلوق اپنے اپنے انداز سے اپنے مالک کی حمد و ثناء میں مصروف ہے۔ علامہ ابن کثیر دمشقی نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے استوانہ حنانہ کا واقعہ نقل کیا ہے اور اسے حدیثِ متواتر قرار دیا ہے (ابن کثیر جلد ۴ ص ۳۴۳)۔ ابن کثیر نے اس واقعہ سے کھجور کے تنے میں ذکرِ الٰہی اور وحی خداوندی سے محروم ہونے کا شعور ثابت کیا ہے۔ تعجب ہے کہ علامہ ابن کثیر نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے پہاڑوں میں فہم و شعور کی شرط لگائی ہے اور بعد والے حضرات مفسرین نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے' حالانکہ استوانہ حنانہ کی روایت کو متواتر کہہ کر نقل کرنے کے بعد علامہ ابن کثیر کی اوپر والی رائے محل نظر ہو جاتی ہے۔

اس کلامِ حق کا جب پہلی دفعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ انور پر نزول ہوا تو آپ فطری طور پر کلامِ حق کی جلالت سے متاثر ہوئے۔ یہ تاثر معتبر روایات کے ذریعے احادیث کی کتابوں میں موجود ہے اور وہ لوگ جو کلام حق کی جلالتِ شان کا عرفان نہیں رکھتے وہ ان روایات کا انکار کرتے ہیں۔

اعلانِ نبوّت سے پہلے اور اعلانِ نبوّت کے بعد

اعلانِ نبوت سے پہلے' ہونے والے نبی کے علم و عمل کی حالت کیا ہوتی ہے اور اس حالت (قبل اعلان) پر نبی و رسول کے القاب کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور دونوں حالتوں میں کیا فرق ہے---؟

اعلانِ نبوت سے پہلے کی حالت سورۃ الشوریٰ میں بایں الفاظ مذکور ہے :

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾

(الشوریٰ : ۵۲)

"(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! وحی کے جو تین طریقے اوپر بیان کیے گئے' ان ہی کے مطابق) اسی طرح ہم نے آپ پر اپنے حکم سے روح (وحی) نازل کی' آپ کو اس سے

پہلے اس کی خبر نہ تھی کہ کتاب الٰہی کیا چیز ہے اور اس کا بھی پتہ نہ تھا کہ ایمان کیا ہوتا ہے' لیکن اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنادیا جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں راہ حق دکھاتے ہیں۔ بے شک آپ سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں"۔

منصبِ نبوت پر فائز ہونے اور کارِ نبوت کی ذمہ داری اٹھانے سے پہلے نبی و رسول اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمان بالغیب اور توحیدِ الٰہی کے اجمالی شعور و فہم سے آراستہ ہوتا ہے اور اس کے دل و دماغ میں یقین و عرفان اور اس کی عملی زندگی میں اخلاق حمیدہ کی روشنی صاف صاف محسوس ہوتی ہے' اور اہل نظر ہونے والے اس نبی و رسول کے اندر اس کے شاندار مستقبل کا رنگ و اثر دیکھ لیتے ہیں۔ اس آیت پاک میں (نبوت سے قبل) ایمان اور کتاب الٰہی کے تفصیلی علم کی نفی کی گئی ہے' حقیقتِ ایمان کی نفی نہیں کی گئی۔ یہ حقیقتِ ایمان و عرفان نبی کو فطری طور پر عطا کیا جاتا ہے' نبی کو پیدائشی طور پر ہی تمام ذہنی اور فکری قوتیں عام انسانوں کے مقابلے میں امتیازی درجہ کی عطا کی جاتی ہیں۔

سورۃ الضحیٰ (آیت ۷) میں قبل از نبوت حالت کو "ضلال" سے تعبیر کیا گیا ہے :

﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾

"اور آپ کو (اللہ تعالیٰ نے) شریعت سے بے خبر پایا تو شریعت کا راستہ بتلا دیا"۔

عربی لغت میں "ضلال" کے مختلف معانی آتے ہیں' جن میں سے ایک معنی گمراہ ہونا ہے۔ یہ مفہوم یہاں مراد نہیں لیا جا سکتا' کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے کی زندگی گواہ ہے کہ آپ نے ان چالیس سالوں میں کبھی بت پرستی' اخلاقی برائی اور گناہ کا کوئی کام نہیں کیا' اس لئے اس آیت میں ضلال کے دوسرے معانی مراد لئے جائیں گے۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے مذکورہ بالا آیت (الشوریٰ : ۵۲) کی روشنی میں "ضلال" کا ترجمہ "شریعت سے بے خبر" کیا "دین سے بے خبر" نہیں لکھا' کیونکہ "الدین" سے اصول دین' توحید' آخرت اور نبوت مراد ہوتے ہیں اور نبی و رسول کے اندر دین کے اصولوں کا فطری عرفان موجود ہوتا ہے۔ البتہ شریعت یعنی دین کے تفصیلی احکام و مسائل کا علم اعلان رسالت کے بعد عطا کیا جاتا ہے۔ مولانا احمد رضا خان صاحب

نے اپنے ذوق کے مطابق شریعت کی جگہ محبت کا مفہوم مراد لیا اور یہ ترجمہ کیا : "اس نے آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی"۔ یہی دو بنیادی مفہوم ہیں۔ چنانچہ دوسرے مترجمین نے انہی دو ترجموں میں سے ایک ترجمہ کو اپنایا ہے۔

سورۂ یوسف میں حضور ﷺ کو مخاطب کر کے کہا گیا :

﴿وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغَافِلِيْنَ﴾ (آیت ۳)

"اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) اس واقعہ کے بیان سے پہلے آپ بے خبر لوگوں میں سے تھے"۔

ان واضح آیات کی روشنی میں اعلانِ نبوت سے پہلے اور اعلان کے بعد کی دونوں حالتوں میں کوئی نہ کوئی فرق تو تسلیم کرنا پڑے گا۔

دونوں حالتوں میں فرق کی نوعیتیں

(۱) عقلی طور پر منطق کی اصطلاح کے مطابق یہ فرق "نبوۃ بِالقُوّہ" اور "نبوۃ بِالفعل" کا ہے۔

(۲) قرآن کریم کی تصریحات (سورۃ الشوریٰ : ۵۲ اور سورۃ الضحیٰ : ۷) کے مطابق یہ فرق اجمال و تفصیل کا ہے۔

یعنی اجمال میں تفصیل سے بے خبری ہوتی ہے---اور محبت کی تعبیر کے مطابق یہ فرق محبت کی بے قراری سے نکل کر حقیقت کے وصال کی منزل میں داخل ہونے کا ہے۔ اس تعبیر کو جگر صاحب کے اس شعر کی روشنی میں بآسانی سمجھا جا سکتا ہے ؎

گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ!
سن رہا ہوں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

نبوت کے اعلان سے پہلے نبی اپنے روحانی ادراک کے ذریعے حقیقت کا وہ نغمہ سن لیتا ہے جو ابھی ساز کے اندر ہوتا ہے اور اعلانِ نبوت کے بعد وہ نغمہ ساز سے باہر آجاتا ہے اور نبی اپنے حواسِ ظاہری کے ذریعے غیبی حقیقت کو محسوس کر لیتا ہے۔ روحانی ادراک جب ادراک بالحواس کی منزل میں داخل ہوتا ہے تو نبی کے حواس میں ایک انقلابی تاثر پیدا

ہوتا ہے۔اس تاثر کو میر تقی میر کے الفاظ میں بھی سمجھا جاسکتا ہے ؎

ہو گیا اس کو دیکھ حیران دل
بات کرنے کا حوصلہ نہ رہا

نبوت کے بجائے رُشد کا اطلاق

قرآن کریم نے اس امتیازی علم و بصیرت پر نبوت اور نبی کا اطلاق نہیں کیا بلکہ لفظ "رُشد" کا اطلاق کیا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا :

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ﴾

"اور ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے اس کی (شان کے مطابق) ہدایت و سعادت سے نوازا تھا اور ہم اس (کی فطری صلاحیت) کو (جو ہم نے ہی تخلیق کی تھی) جاننے والے تھے"۔

قرآن کریم میں یہ لفظ (رُشد) کئی معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک جگہ قرآن کریم میں لفظ رُشد، غَیّ کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ اس وقت اس کے معنی ہدایت و راہ روی کے ہوتے ہیں۔

﴿قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (البقرہ : ۲۵۶)

"ہدایت، گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے"۔

ایک جگہ (الجن : ۲۱) میں ضَرًّا (نقصان) کے مقابلہ میں رَشَدًا آیا ہے۔ یہاں نقصان کے مقابلہ میں نفع اور بھلائی کا مفہوم ہے۔

المومن : ۳۸ میں "سَبِيْلَ الرَّشَادِ" وحی الٰہی اور دین کے راستہ کے معنی میں لایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو "وَلِیّ مُرشِد" اسی مفہوم میں کہا ہے :

وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا (کہف : ۱۷)

"اور جسے اللہ تعالیٰ ہی بے راہ کرے تو (اے نبی ﷺ) آپ اس کے حق میں کسی راہ پر لانے والے ہمدرد اور دوست کو نہ پائیں گے"۔

قرآن کریم میں سورۃ النساء (آیت ۶) میں رشد کے لفظ کو سفاہت (بے عقلی) کے مقابلہ میں شعور مندی اور ہوشیاری کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

سورۂ کہف (آیت ٦٦) میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر (علیہما السلام) کے واقعات میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کے پاس وحی کا علم (نبوت کا منصب) تھا اور حضرت خضر کے پاس علمِ لدُنّی (خاص علم) تھا اور دونوں علوم کے دائرے الگ الگ تھے۔ علمِ لدُنّی سے تکوینی معاملات کا علم اور اسرارِ کائنات کا فہم مراد ہے۔ حضرت موسیٰ خضر علیہ السلام سے علمِ لدنّی حاصل کرنے کی غرض سے ان کی خدمت میں بحکمِ الٰہی گئے تھے۔ حضرت خضر کے اس خاص علم کو حضرت موسیٰ نے "رُشد" سے تعبیر کیا ہے :

﴿قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ۝﴾

"موسیٰ نے ان سے کہا : کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اس دانش کی تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے؟"

لیکن حضرت موسیٰ خضر علیہ السلام کے اس علم کو برداشت نہ کر سکے، کیونکہ وہ انہیں علمِ وحی (قانون الٰہی) کے خلاف نظر آیا، اور چند روز ان کے ہمراہ رہ کر واپس آ گئے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ تعلیم و تربیت نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رشد وہدایت کے جس عالی مرتبہ پر پہنچایا اس کا تعارف تفصیل کے ساتھ سورۃ الحجرات میں ان الفاظ میں کرایا گیا ہے۔ حضرات صحابہ کو مخاطب کر کے خطاب عام کے ذریعے کہا گیا :

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ (الحجرات : ۷-۸)

"(اے لوگو!) اس بات کو سمجھ لو کہ تمہارے درمیان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے جو ہستی موجود ہے وہ) اللہ کا رسول ہے۔ وہ (رسول ہوتے ہوئے) اگر اکثر باتوں میں (بعض دنیوی باتوں کے علاوہ) تمہارے کہنے پر چلے تو تم مشکلات میں پڑ جاؤ (جیسا کہ تم میں سے بعض کمزور ایمان والے، جیسے ولید بن عقبہ یہی خواہش رکھتے تھے)

لیکن (اے صحابہ رسول!) تم کو اللہ نے ایمان کی محبت دی اور تمہارے دلوں میں ایمان کو پسندیدہ بنادیا اور کفر و نافرمانی اور گناہ کی طرف سے تمہارے دلوں میں نفرت پیدا کر دی۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے ہدایت و سعادت والے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑی حکمت اور بڑے علم والا ہے"۔

ظاہر ہے کہ جس ذاتِ اقدس کی تعلیم و تربیت نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رُشد و ارشاد کے اس مرتبہ عالی پر پہنچایا اس ذاتِ اقدس میں وحیِ الٰہی کے نزول سے پہلے رشد و سعادت کی روشنی کس اعلیٰ درجہ پر ہوگی اور وحی الٰہی کی روشنی سے منور ہونے کے بعد نورٌ علیٰ نور کا کیا حال ہوگا!

اعطاءِ نبوت' پختہ عمر میں؟

اللہ تعالیٰ کی سنّت یہ رہی ہے کہ اس نے نبوت کے لئے اپنی منتخب ہستیوں کو کارِ نبوت اس وقت سونپا جب ان کی عمر طبعی پختگی کی منزل پر پہنچ گئی۔ نبوت کا کمال انسان کی سعی و کوشش سے تعلق نہیں رکھتا' بلکہ یہ حق تعالیٰ کے اپنے انتخاب اور خاص فضل و کرم سے تعلق رکھتا ہے' اس لئے ہونے والے نبی و رسول میں شروع ہی سے فکر و عمل کی خصوصیات ظاہر ہونے لگتی ہیں اور وہ بندۂ خاص عام انسانوں کے مقابلے میں جلدی نشو و نما پاتا ہے اور جلدی ہی پروان چڑھتا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کی سنّت اور اس کا معمول یہی رہا ہے کہ وہ عالمِ اسباب کے مطابق بھرپور جوانی میں اس کی نبوت کا اعلان کرتا ہے اور اس پر وحی نازل کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ

﴿وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ (یوسف : ۲۲)

"اور جب وہ پوری قوت کی منزل پر پہنچ گیا تو ہم نے اسے حکمت و دانائی اور علمِ شریعت عطا کیا' اور ہم حسنِ عمل والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں"۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا :

﴿وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ (القصص : ۱۴)

"اور جب وہ بھرپور جوانی کی منزل پر پہنچ گیا اور اس کا نشو و نما مکمل ہو گیا (جب وہ سنبھل گیا: شاہ صاحب") تو ہم نے اسے حکمت و علم عطا کر دیا اور ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں"۔

بائبل میں ہے کہ اس وقت حضرت موسیٰ کی عمر چالیس سال تھی (اعمال : ۷۔۲۳)

سورۃ الاحقاف (آیت ۵) میں عام انسان کے متعلق کہا گیا :

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً

"یہاں تک کہ جب وہ (انسان) جوانی پر پہنچ گیا اور اس کی عمر چالیس سال کی ہو گئی"۔

اسی عمر میں عام طور پر انسان کی جسمانی' عقلی اور اخلاقی قوت پختہ ہو جاتی ہے۔ صحیح روایات میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی چالیس برس کی عمر میں نبوت ملی۔

نبوت وہبی کمال اور فطری صلاحیت ہے

منطقی اصطلاح کے مطابق ہونے والا نبی ابتدا ہی سے "نبوۃ بالقوۃ" (صلاحیتِ نبوت) سے متصف ہوتا ہے اور نزولِ وحی کے بعد "نبوۃ بالفعل" کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ منصبِ نبوت کے وہبی ہونے کا بھی یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو نبوت عطا کرنا چاہتا ہے اسے ابتدا ہی سے نبی بننے کی صلاحیتوں سے نوازتا ہے :

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ (الانعام : ۱۲۵)

"اللہ ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کس سے اپنی پیغامبری کا کام لے اور کس طرح لے"۔

اسی مفہوم (صلاحیتِ نبوۃ) کے لحاظ سے حضور ﷺ نے فرمایا :

کُنْتُ نَبِیًّا وَآدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْن

"میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم ابھی پانی اور مٹی کے درمیان تھے"۔

اس پیرائے میں حضور ﷺ نے اپنے یقینی نبی ہونے کا اظہار کیا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے اعلان کا مطلب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ماں کی گود میں اپنی نبوت کا اعلان کیا :

﴿قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا﴾ (مریم : ۳۰)

"کہنے لگا: میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا"۔

حضرت عیسیٰ کی یہ گفتگو ماں کی گود میں ان کا معجزہ تھا' جو مخالفین کے الزام کی تردید میں آپ سے صادر ہوا۔ حضرت عیسیٰ نے شیر خوارگی کی حالت میں جو یہ اعلان فرمایا' علماء نے اس کی حسب ذیل تاویلات کی ہیں :

(۱) قرآن کریم کا یہ عام اسلوب ہے کہ وہ مستقبل میں ہونے والے واقعاتِ آخرت کے یقینی ہونے کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ ان واقعات کے لئے ماضی کا فعل استعمال کرتا ہے۔ مثلاً اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰہِ (النحل : ۱) "قیامت کا واقعہ ہو چکا"---- یعنی یقیناً ہونے والا ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے اپنی معجزانہ گویائی میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مجھے نبی بنائے گا اور کتاب دے گا اور میں تو اس کا ایک بندہ ہوں۔

(۲) نبوت کا اعلان فطری صلاحیت کے لحاظ سے کیا گیا۔

مؤخر الذکر تاویل پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ نبوت تو ایک باطنی شے ہے' اس کے بارے میں تو یہ تاویل درست ہے' لیکن کتاب تو ایک ظاہری چیز ہے' اس کے بارے میں یہ تاویل کیسے درست ہو سکتی ہے؟ اور ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ کو انجیل اس وقت دی گئی جب آپ انجیل کے پیغام کو پیش کرنے کے قابل ہوئے اور دعوت و تبلیغ کا سلسلہ آپ نے شروع کیا۔ اس لئے دونوں باتوں کے اعلان کی پہلی تاویل ہی معقول کہی جا سکتی ہے۔

بدءالوحی کی روایت پر اعتراض اور اس کا جواب

دہلی کے ایک مذہبی اجتماع میں امامیہ فرقہ کے مشہور مقرر فیروز حیدر صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پیدائشی نبی تھے' پھر بخاری کی یہ حدیث پیش کی کہ جب آپؐ پر غار حرا میں وحی کا آغاز ہوا تو اس سے آپ پر کپکپی طاری ہو گئی اور آپ نے کہا "زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ" (مجھے چادر اڑھاؤ' چادر اڑھاؤ)۔ پھر کہا کہ "یہ روایت یہودیوں کی خود ساختہ ہے' بھلا نبی و رسول کو وحی کے نزول سے بخار چڑھنے کا کیا مطلب ہے؟"۔

بخاری شریف کی یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے۔ آپؓ وحی کے نزول کے وقت موجود نہیں تھیں۔ حضرت خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا اس وقت آپ کی حرم تھیں، لیکن حضرت عائشہ نے جو حالات بیان کئے وہ حضور ﷺ سے سنے ہوئے تھے۔ آپ کی روایت میں ہے: "یَرجُفُ فُؤادُہ" "آپؐ کا دل کانپ رہا تھا"--- آپؐ نے فرمایا: "زَمِّلُونی، زَمِّلُونِی" (مجھ پر چادر ڈال دو، مجھے چادر اڑھادو) "فزَمِّلُوہُ حتّٰی ذَھَبَ عنہُ الرَّوْعُ" (پس لوگوں نے آپ کو چادر اوڑھادی، یہاں تک کہ آپؐ کا خوف دور ہوگیا)۔ پھر حضرت خدیجہؓ کو آپؐ نے واقعہ سنایا اور فرمایا: "لَقَدْ خَشِیتُ علٰی نَفسِی" (مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہوا)---یہ بات آپؐ نے اس بات پر فرمائی ہوگئی کہ جبریل امین نے آپؐ کو اپنے سینے سے لگا کر بھینچا---اور تین دفعہ بھینچا۔

امام بخاری نے اس روایت کے بعد دوسری روایت حضرت جابر بن عبداللہ کی نقل فرمائی۔ اس میں ہے کہ فرشتہ وحی کو ان کی پُر جلال صورت میں دکھایا گیا۔ آپ نے فرمایا: میں چلا جارہا تھا کہ ایک آواز سنائی دی، میں نے آسمان کی طرف دیکھا،

فَاِذا المَلَکُ الّذی جاءَنِی بِحِراءَ جالسٌ علٰی کرسیٍّ بینَ السَّماءِ وَالارضِ فَرُعِبْتُ مِنْہُ

"تو یہ دیکھا کہ جو فرشتہ حرا میں میرے پاس آیا تھا وہ ایک کرسی پر بیٹھا ہے جو آسمان و زمین کے درمیان بچھی ہوئی ہے، تو میں نے اس سے خوف محسوس کیا"۔

پہلی وحی کے چند روز بعد آپ کو یہ روحانی مشاہدہ کرایا گیا۔ اس مشاہدہ کے بعد بھی آپؐ نے گھر والوں سے وہی فرمایا جو پہلے مشاہدہ میں فرمایا تھا: "زَمِّلُونِی، زَمِّلُونِی"۔

اس سے امام بخاری کی فراست ظاہر ہوتی ہے، وہ سمجھ رہے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک فرقہ حضرت عائشہؓ کے راوی ہونے کی وجہ سے اس روایت سے انکار کرے، اس لئے دوسری روایت حضرت جابرؓ سے نقل کردی۔ دونوں موقعوں پر آپ ان مشاہدات سے متأثر ہوئے، اور یہ تأثر، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، دونوں حالتوں کے فرق کی وجہ سے تھا۔ غارِ حرا کی ابتدائی وحی کے بعد بھی، متعدد صحیح روایات سے ثابت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب بھی وحی نازل ہوئی آپ پر اس کا تاثر دیکھا گیا۔ کبھی ایسا ہوا کہ

ادھر قلبِ مبارک پر وحی کا نزول ہوا اور ادھر آپ کی مبارک پیشانی سے موتیوں کی طرح پسینہ ٹپکنا شروع ہوا۔ کبھی یہ دیکھا گیا کہ آپ اونٹنی پر سوار تھے اور وحی کا نزول شروع ہو گیا تو اونٹنی کے جوڑوں کی ہڈیوں میں سے چرچراہٹ کی آواز آنے لگی۔ کبھی ایسا ہوا کہ کسی اہل خانہ کے زانو پر آپ کا سرِاقدس تھا اور وحی آگئی تو اسے یہ محسوس ہوا کہ اس کا زانو بوجھ سے ٹوٹ جائے گا۔ ایسی صورت حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ پیش آئی کیونکہ ازواجِ مطہرات میں حضرت صدیقہ جوان العمر ہونے کی وجہ سے طاقتور تھیں۔ مصلحتِ الٰہی نے اس کے لئے آپؐ کا انتخاب کیا تا کہ وحی کے بوجھ کا صحیح اظہار ہو سکے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر فطری تأثرات

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عام انسانوں کی رہنمائی کے لئے تشریف لائے تھے اور اس بنیاد پر ضروری تھا کہ آپؐ کا اسوۂ حسنہ اور نمونہ حیات انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی ہدایت کے لئے مکمل نمونہ ہو۔ آپ اگر اہل غیب کی ہدایت کے لئے تشریف لاتے تو اور بات تھی، مگر آپ اہل اسباب کی ہدایت کے لئے تشریف لائے، اس لئے آپ کی زندگی میں فطری تاثرات کا ہونا ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یقین دلایا تھا :

﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدہ : ۶۸)

"(اے نبیؐ!) اللہ تعالیٰ لوگوں کے ہاتھوں ہلاکت سے (اَن یَقْتُلُوکَ : جلالین، ص ۱۰۴) آپ کو محفوظ رکھے گا"۔

حضور ﷺ اس یقین دہانی کے باوجود میدان جہاد میں ہتھیار بند ہو کر تشریف لے جاتے تھے اور غزوۂ احد میں آپؐ کے جسم اقدس پر دو عدد آہنی زرہیں تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے برائیوں سے آپ کی حفاظت کا بھی اعلان کیا تھا :

﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾ (الفتح : ۱)

اللہ تعالیٰ آپ کو خوشخبری دیتا ہے کہ آپکو گناہوں سے مکمل طور پر محفوظ رکھے گا۔ سورۃ الفتح کی یہ مشہور آیت ہے اور اس جگہ مغفرت کے اعلان کی مختلف تاویلات کی گئی ہیں، لیکن میں اس تاویل کو ترجیح دیتا ہوں کہ اس جگہ "غَفَرَ" حفاظت کے معنی میں آیا ہے۔

عربی میں "مِغْفَر" لوہے کے خود کو کہا جاتا ہے جو سر کی حفاظت کرتا ہے "غَفِیرَۃ" ڈھکنے کو کہا جاتا ہے جو برتن کے کھانے کی حفاظت کرتا ہے "غفارت" کے معنی رات کو پہرہ دینے کے ہیں جو چوروں سے حفاظت کے لئے ہوتا ہے۔ اس یقین دہانی کے باوجود دوسری طرف آپ کو استغفار کرنے کا حکم دیا گیا ہے : ﴿فَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ﴾ (محمد : ۹) اور آپ اس حکم کی تعمیل میں دن میں ستر ستر دفعہ استغفار کرتے تھے۔ یہ اس لئے تا کہ آپ کی زندگی میں امت کے لئے استغفار کرنے کا نمونہ موجود ہو۔

آپ ﷺ کی عصمت شیطانی وسوسوں اور اس کی اغواکاریوں کی طرف سے بھی تھی، مگر اسی کے ساتھ آپ کو ہدایت کی گئی تھی :

﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ﴾

(النحل : ۹۸)

اور آپ استعاذہ کرتے تھے اور "اعوذ باللہ" پڑھتے تھے۔

دشمنوں کے حملہ کا خوف ایک فطری تاثر تھا، اسی طرح شیطانی وسوسہ اندازی کا اندیشہ بھی ایک فطری احساس تھا اور آپ پر یہ دونوں تاثرات پیدا ہوتے تھے۔

فطری تاثرات، صوفیاء کے ہاں

شیخ المشائخ حضرت محبوب الٰہی علیہ الرحمہ نے صبر اور رضا پر گفتگو کرتے ہوئے دونوں کے درمیان فرق بیان فرمایا :

"صبر یہ ہے کہ تکلیف و مصیبت کو برداشت کرے اور اس کی شکایت زبان پر نہ لائے، اور رضا یہ ہے کہ مصیبت آئے تو اس پر اسے ناگواری کا احساس بھی نہ ہو، جیسے کہ مصیبت آئی نہ ہو"۔

پھر شیخؒ نے علماءِ عقل (متکلمین) کا نظریہ بیان کیا :

"متکلمین اور اہل کلام رضا کے اس مفہوم سے اتفاق نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ مصیبت آئے اور اس کا احساس نہ ہو، یہ فطرت انسانی کے خلاف ہے"۔

اس کے بعد شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مثال بیان کی اور فرمایا :

"اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی راہ گیر کے پیر میں کانٹا چبھ جاتا ہے اور خون بہنے لگتا، مگر

اس راہ گیر کو جلدی جانے کی دھن میں اس تکلیف کا خیال تک نہیں آتا اور بعد میں اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کے پیر میں تکلیف ہے۔ تو اگر جسمانی مشغولیت تکلیف سے بے خبر کر سکتی ہے تو کیا یاد الٰہی کی قلبی اور روحانی مشغولیت تکلیف و مصیبت سے بے خبر نہیں رکھ سکتی؟"۔

غور سے دیکھا جائے تو شیخ نے علماء کلام کے نظریہ کی تردید نہیں کی' بلکہ اپنے نظریئے کی تشریح کر کے یہ بتایا ہے کہ تکلیف کا احساس ایک فطری امر ضرور ہے' لیکن اس فطری احساس و تاثر کو مشغولیت اور محویت اور استغراق کی کیفیت مغلوب کر دیتی ہے۔ فطری احساس کا پیدا ہونا فطرت کے ساتھ لگا ہوا ہے' البتہ جب اس احساس پر یادِ حق کا جذبہ غالب آجاتا ہے تو پھر وہ احساس فطری دب جاتا ہے۔ میر مہدی مجروح کہتے ہیں ؎

کس کو معلوم ' جان کب نکلی
محو تھے ہم تو یادِ جاناں میں

فطری تاثرات کے معاملہ میں اگر شیخ علیہ الرحمہ کی اس تشریح کو سمجھ لیا جائے تو پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ پاک کے بعض اہم گوشوں کی تعبیر کے بارے میں جو الجھنیں اہل علم کو پریشان کرتی ہیں اور ان کی وجہ سے اہل علم کے اندر اختلافات پیدا ہوتے ہیں' وہ نہ ہوں۔

اسلام دینِ فطرت' حضورؐ رسول فطرت

اسلام دین فطرت ہے اور دین فطرت کے ہادی بھی رسول فطرت ہیں۔ آپ کا اسوۂ حسنہ انسانی برادری کے لئے مکمل نمونہ ہے۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سبا : ۲۹)

"ہم نے تو (اے رسول ﷺ) آپ کو تمام انسانوں (کی ہدایت) کے لئے (کافی اور مکمل نمونہ ہدایت یعنی) بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے"۔

یہ زندگی اسباب پر قائم ہے' انسانی فطرت اسباب ظاہری سے متاثر ہوتی ہے۔ یہ تاثر اس ذاتِ اقدس کے لئے بھی ضروری تھا جو اہل اسباب کی رہنمائی کے لئے بھیجی گئی تھی' ورنہ اس کی حیاتِ طیبہ اہل اسباب کے لئے مکمل نمونہ نہیں بن سکتی تھی۔

روایتی حیثیت سے اس کا جواب

متذکرہ بالا حدیث پر مذکورہ بالا اعتراض کا روایتی حیثیت سے جواب یہ ہے کہ محدثین اہل سنت کا یہ اصول ہے کہ "الصَّحابۃُ کُلّھم عَدُول" یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات نقل کرنے میں اور آپ کے اقوال نقل کرنے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب عادل ہیں، ثقہ ہیں، معتبر ہیں۔ اور صوفیاء اہل سنت کا یہ اصول ہے جو حضرت شیخ المشائخ علیہ الرحمہ نے بیان فرمایا : "طبقۃُ الصحابۃِ، طبقۃُ العلمِ وَالمُشاھَدَۃ"۔ حضرت شیخ نے امتِ مسلمہ کو چھ طبقوں میں تقسیم کیا ہے اور صحابہ کرام کے طبقہ کو طبقہ اولیٰ قرار دے کر اسے علم و مشاہدہ کا دور کہا ہے۔ شیخ کا مطلب یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام کو براہ راست سینہ نبوت اور مشکوٰۃِ وحی سے جو علم حاصل ہوا وہ مشاہدۂ حقیقت کے درجہ کا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس طبقہ کا علم "عین الیقین" یعنی مشاہدہ کے درجہ کا ہو اس کی نقل و روایت کو تسلیم نہ کرنا ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں۔

واضح رہے کہ یہ ان روایات کے بارے میں ہے جن کو نہایت سخت تنقیدی اصولوں کے مطابق منتخب کیا گیا ہے اور صحاح کی روایات کا یہی درجہ ہے۔ راویانِ احادیث کے حالات کی چھان بین کے لئے محدثین اہل تحقیق نے جو تحقیقی کاوش کی ہے اس کاوش کا نام فنِ اسماء الرجال ہے اور اہل مغرب دانشوروں نے تسلیم کیا ہے کہ اس فن کو وجود میں لانے کے لئے محدثین نے جو علمی کاوش کی ہے اس کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں ملتی۔

اس ضمن میں ایک مثال جماعت صحابہؓ میں آپؐ کی زوجہ مطہرہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی ہے۔ حضرت ماریہؓ ایک مصری قبطی کنیز تھیں جو مصر کے حکمران نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدیہ کی تھی، آپؐ نے ماریہ کو اپنے حرم محترم میں داخل کر کے انہیں امّہات المومنین کے اعزاز سے نوازا۔ حضرت ماریہ کے بطن سے آخر عمر میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔ ابراہیم چھ مہینے کے بعد حضور کو داغِ مفارقت دے گئے۔ ایک روز حضورؐ نے حضرت ماریہ قبطیہ کو دیکھا کہ وہ اپنے بچے کی یاد میں مغموم بیٹھی ہیں، آپ نے فرمایا : ماریہ، ابراہیم کی جدائی

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ

(۶۶۱ھ تا ۷۲۸ھ)

عبدالرشید عراقی

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ اپنے دور کے ایک متبحر عالم، محدث، مؤرخ، فقیہ اور نقاد تھے۔ آپ نے علوم اسلامیہ میں جو مجتہدانہ مقام حاصل کیا اور علوم اسلامیہ خاص طور پر تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ میں اپنے تبحر علمی کا جو نقش اپنے زمانہ میں قائم کیا، اس میں بہت بڑا دخل ان کے غیر معمولی حافظہ اور ذہانت کو تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیر معمولی حافظہ کی نعمت سے نوازا تھا، جس کی وجہ سے آپ نے تمام علوم اسلامیہ میں مہارت حاصل کرلی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے دور میں دین اسلام کے خلاف جس قسم کی بھی شورش برپا ہوئی آپ نے اس کا دندان شکن جواب دیا۔

امام ابن تیمیہ نے اپنے تبحر علمی، شوق مطالعہ اور ذوق علم سے اسلامی علوم اور رائج الوقت علوم وفنون میں ایسی جامعیت پیدا کی کہ ان کے معاصرین جو اپنے فن میں امام تسلیم کئے جاتے تھے، انہوں نے امام صاحب کے تبحر علمی اور علم وفضل کا اعتراف کیا ہے۔ علامہ ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ ناصرالدین (م ۸۴۲ھ) نے اپنی کتاب "الردالوافر" میں علامہ تقی الدین ابن دقیق العید (م ۷۰۲ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

> "جب ابن تیمیہ سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ تمام علوم اس شخص کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ جو چاہتا ہے لے لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے۔" (الردالوافر، ص ۳۱)

تفسیر اور حدیث میں ان کو کمال حاصل تھا۔ حدیث کے رواۃ اور اسناد پر ان کی گہری نظر تھی اور حدیث میں آپ کی واقفیت پر معاصرین نے یہ شہادت دی کہ

"جس حدیث کو ابن تیمیہ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں ہے"۔

(الکواکب الدریہ' ص ۱۴۵)

تاریخ ان کا خصوصی فن نہیں تھا اور نہ ہی اس کو اپنا موضوع بنایا۔ تاہم ارباب سیر نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ تاریخ میں بھی ان کی واقفیت غیر معمولی اور حیرت انگیز تھی۔ امام ابن تیمیہ جہاں ایک بلند پایہ مصنف' نقاد اور محدث و فقیہ تھے' وہاں آپ صاحب سیف بھی تھے' اور ان کے صاحب سیف ہونے کی شہادت بھی ان کے معاصرین نے دی ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ اپنے معاصرین میں اپنے علمی تبحر کی وجہ سے ممتاز تھے اور معاصرین نے ان کے علمی تبحر کا اعتراف کیا ہے' لیکن ان کا اصلی امتیاز ان کا علمی تبحر نہ تھا بلکہ ان کا اصلی امتیاز ان کا فکری استقلال' ذوق تحقیق اور مجتہدانہ انداز تھا۔ امام ابن تیمیہ میں سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آپ نے ناقدانہ حیثیت سے کتابوں کا مطالعہ کیا اور جو چیز بھی خلاف شریعت محمدیہ نظر آئی' اس کا دندان شکن جواب دیا۔ مثلاً علم نحو میں سیبویہ کو امام نحو تسلیم کیا جاتا ہے' اور اس کے قول کو حرف آخر مانا جاتا ہے۔ آپ نے سیبویہ کی کتاب کا ناقدانہ مطالعہ کیا اور فرمایا :

"سیبویہ کوئی نبی نہیں تھا' جس پر نحو اتری ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں ۸۰ مقامات پر غلطی کی ہے۔"

اسی طرح آپ نے یونانی فلسفہ و منطق کا ناقدانہ حیثیت سے مطالعہ کیا اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اپنی کتاب "الرد علی المنطقیین" میں یونانی فلسفہ و منطق پر ناقدانہ بحث کی۔ امام ابن تیمیہ نے تقریباً تمام غیر اسلامی مذاہب و عقائد کی تنقید و تردید کی اور زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ اس علمی جہاد میں صرف کیا۔

عیسائیت کی تردید

مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ اسلامی ممالک میں دوسرے مذاہب و ادیان نے نئی کروٹ لی اور ان مذاہب و ادیان میں سب سے زیادہ مستعدی مسیحیت نے دکھائی۔ اس وقت عیسائیوں کی بہت زیادہ تعداد مصر و شام میں موجود تھی۔ شام کی

سرحدیں تو عیسائی ممالک سے ملتی تھیں اور عیسائی مبلغین اس کوشش میں مصروف تھے کہ کسی طرح شام دوبارہ مسیحیت کے جھنڈے کے نیچے آجائے۔ ۶۵۸ھ میں جب تاتاریوں نے دمشق (شام) پر یلغار کی اور فاتحانہ دمشق میں داخل ہوئے تو عیسائیوں نے شہر سے نکل کر تاتاریوں کا استقبال کیا تھا اور ان کو تحائف بھی پیش کئے تھے۔ اسی زمانہ میں قبرص سے ایک عیسائی مصنف کی کتاب دمشق پہنچی جس میں عقلی اور نقلی دلائل سے مسیحیت کا اثبات پیش کیا گیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو عمومی نہیں بلکہ خاص عربوں کی طرف مبعوث ہونے کے دلائل دیئے گئے تھے اور یہ دعویٰ بھی کیا گیا تھا کہ عیسائی آپؐ پر ایمان لانے کے مکلف نہیں۔

امام ابن تیمیہ نے اس کتاب کا جواب چار جلدوں میں "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح" کے نام سے دیا۔ اس میں آپ نے صرف مدافعت اور صفائی کو ہی پیش نظر نہیں رکھا بلکہ مسیحیت کی بنیادوں پر بھی حملہ کیا۔ آپ نے نبوتِ محمدیؐ کو ثابت کرنے کے لئے قدیم وجدید دلائل دیئے، مسیحیت کی تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور آنحضرت ﷺ کی بعثت پر پیش گوئیوں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا جو کسی ایک کتاب میں جمع نہیں ہو سکتا۔ یہ امام ابن تیمیہ ہی تھے جنہوں نے عیسائیت کی تردید میں ایسی لاجواب کتاب لکھی کیونکہ آپ فلسفہ، علم کلام اور عقائد و فرق پر وسیع نظر رکھتے تھے اور دوسری طرف عہد عتیق وجدید کے صحائف پر بھی آپ کو پورا عبور تھا۔

شیعیت کی تردید

عیسائیت کی تردید کے بعد شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے شیعیت کی تردید میں ایک لاجواب کتاب "منهاج السنة النبوية في نقض كلام الشيعة والقدرية" تصنیف کی۔ اس کی تصنیف کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک شیعی عالم ابن المطہر الحلی نے "منہاج الکرامہ فی معرفۃ الامامہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں مصنف نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کی امامت و عصمت کے ثبوت، اور خلفائے ثلاثہ کی خلافت کی تردید، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مطاعن پر کافی مواد جمع کیا تھا اور مصنف نے آیاتِ

قرآنی اور احادیث نبویہ سے حضرت علیؓ اور اہل بیت کی امامت و عصمت ثابت کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور اس کے ساتھ اہل سنت کے عقائد پر بھی متکلمانہ بحث کی تھی۔

جب یہ کتاب دمشق پہنچی اور علمائے اہل سنت کی نظر سے گزری تو سب علمائے کرام نے متفقہ طور پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے اس کتاب کا جواب لکھنے کی درخواست کی۔ اس لئے کہ علمائے اہل سنت یہ سمجھتے تھے کہ اس کتاب کا جواب وہی شخص دے سکتا ہے جس کی تمام علوم اسلامیہ خاص طور پر تفسیر، حدیث، تاریخ، آثار، فلسفہ، عقائد اور علم کلام پر گہری نظر ہو۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ نے چار جلدوں پر مشتمل "منهاج السنة النبوية" کی صورت میں اس کا جواب لکھا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے امام ابن تیمیہ کے علمی تبحر، وسعت مطالعہ، حفظ و استحضار، ذہانت و طباعی اور اتقان کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں کہ

> "مصنف منہاج الکرامہ کی عبارت نقل کرنے کے بعد جب ان کے علم و حمیت دینی کو جوش آتا ہے تو ان کے علم کے سمندر میں طوفان اٹھتا ہے اور تفسیر و حدیث، تاریخ و سیر کے معلومات کا لشکر امنڈتا ہے۔" (تاریخ دعوت و عزیمت ج ۲ ص ۳۱۲)

الصارم المسلول الی شاتم الرسول کی تصنیف

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا جذبہ دینی مثالی تھا۔ ۶۹۳ھ میں دمشق میں ایک عیسائی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کی، جس سے دمشق میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ امام صاحب کی دینی حمیت جوش میں آئی اور آپ نے اس کا سختی سے نوٹس لیا۔ آپ نے "الصارم المسلول الی شاتم الرسول" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں آپ نے قرآن و سنت کی روشنی میں تفصیل سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی کہ شاتم رسول کی کیا سزا ہو سکتی ہے۔

حدیث و فقہ اور علمی آثار کی اشاعت پر توجہ

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے دور سے پہلے فقہ و حدیث میں بحث و نظر کے دائرے محدود ہو گئے تھے، جن سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں ہو رہی تھی اور عرصہ دراز سے اس ذخیرہ میں

کوئی اضافہ نہیں ہو رہا تھا۔ امام ابن تیمیہ نے اس طرف پوری توجہ اور کوشش کی اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی تحقیقات کو پیش کیا۔ چنانچہ ساکن حالتوں میں جنبش پیدا ہوئی' غور و فکر اور تحقیقات و تدقیقات کا دروازہ کھلا' اور امام ابن تیمیہ نے کتاب و سنت اور آثار صحابہ کی روشنی میں فتویٰ دینا شروع کیا۔

صاحب الرد الوافر نے امام ذہبی (م ۷۴۸ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

"امام ابن تیمیہ نے سنت خالصہ اور طریقہ سلف کی نصرت میں ایسے دلائل' مقدمات اور وجوہ قائم کئے جن میں وہ منفرد ہیں۔ کسی نے ان سے پہلے ایسے دلائل و مقدمات قائم نہیں کئے۔" (الرد الوافر' ص ۱۷)

امام ابن تیمیہ کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ ساری زندگی علم دین کی خدمت میں مصروف رہے۔ انہوں نے کوئی دینی منصب یا انتظامی ذمہ داری قبول نہیں کی' بلکہ اپنی ساری زندگی علم دین کے اشتغال' افتاء' درس و تدریس' وعظ و ارشاد' تصنیف و تالیف اور تحقیق و تدقیق میں بسر کردی۔ آپ کے اخلاص و للّٰہیت کی ایک بڑی دلیل یہ بھی تھی کہ ساری زندگی کسی سے ذاتی بدلہ نہیں لیا اور اپنے مخالفین کو ہر موقع پر معاف کیا۔ اگر کسی سے اختلاف تھا تو دینی تھا' ذاتی نہیں تھا۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ

"اس اخلاص و انہماک کا نتیجہ یہ تھا کہ انہوں نے ۶۷ سال کی مصروف اور پُر از حوادث واقعات اور تلاطم خیز زندگی میں تصنیفات و تحقیقات اور علمی آثار کا ایک ایسا ذخیرہ چھوڑا جو اہل علم کی ایک پوری جماعت کے لئے سرمایہ افتخار بن سکتا ہے۔ اسی اخلاص و انہماک کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے زمانہ پر ایسے دیرپا اثرات چھوڑے کہ وہ بجا طور پر ایک نئے دور کے بانی اور ایک عہد آفریں شخصیت کے مالک کہے جا سکتے ہیں۔" (تاریخ دعوت و عزیمت' ج ۲' ص ۱۵۵)

امام ابن تیمیہ کے علمی تبحر اور ان کے جامع کمالات ہونے کی وجہ سے کچھ علمائے کرام ان کے مخالف تھے۔ امام صاحب اپنے علم و فضل کے لحاظ سے اعلیٰ مرتبہ و مقام پر

فائز تھے اور عوام و خواص میں مقبول تھے۔ حکومت کی نظر میں بھی ان کا بہت احترام تھا۔ ان کے علم و فضل کے سامنے کسی اور کا چراغ نہیں جلتا تھا۔ تحریر و تقریر، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ آپ نے کسی مخالف کی مخالفت کی پرواہ نہیں کی اور ساری زندگی اشاعت اسلام، کتاب و سنت کی ترقی و ترویج اور شرک و بدعت کی تردید و توبیخ میں بسر کردی۔ حدیث و سنت کے ساتھ امام ابن تیمیہ کے شغف و انہماک کا اعتراف آپ کے مخالفین نے بھی کیا ہے۔ صاحب الکواکب الدریہ شیخ مرعی بن یوسف (م ۱۰۳۳ھ) نے حافظ سراج الدین البزار کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :

"خدا کی قسم میں نے رسول اللہ ﷺ کا اتنا ادب و احترام کرنے والا اور آپ کے اتباع اور آپ کے دین کی نصرت کی حرص رکھنے والا ابن تیمیہ سے بڑھ کر نہیں دیکھا۔" (الکواکب الدریہ، ص ۴۴۹)

عقیدۂ توحید کی تجدید اور مشرکانہ عقائد و رسوم کا ابطال

امام ابن تیمیہ کے دور سے پہلے غیر مسلم اور عجمی اقوام کے اختلاط کی وجہ سے مسلمانوں میں مشرکانہ عقائد و رسوم کا بہت رواج ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گمراہ صوفیوں نے بھی اسلام کی عمارت میں رخنے ڈالنے شروع کردیئے تھے۔ قبر پرستی کا رواج عام ہو چکا تھا۔ ایک اور بری رسم یہ رواج پذیر ہو چکی تھی کہ بزرگوں کے بارے میں الوہیت کا اعتقاد رکھتے تھے اور ان کے مزارات کا طواف کرتے تھے۔ امام ابن تیمیہ نے ان سب مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف جہاد و تجدید کا علم بلند کیا اور عوام کی ناراضگی و مخالفت کے باوجود مروجہ اعمال و رسوم اور مشرکانہ عقائد و خیالات کی تردید کی۔

فلسفہ، منطق اور علم کلام پر تنقید و تردید

یونانی فلسفہ و منطق کا اصل رواج عباسی خلیفہ مامون الرشید (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ) کے عہد سے شروع ہوا۔ مامون الرشید نے اپنی سرپرستی میں یونانی فلسفہ و منطق اور علم کلام سے متعلق کتابوں کے عربی زبان میں ترجمے کرائے۔ خود مامون الرشید یونانی علوم کا بڑا قدردان اور حریص تھا۔ ترجمہ کا کام مامون الرشید کے انتقال (۲۱۸ھ) کے بعد بھی جاری

رہا۔ چنانچہ چوتھی صدی ہجری تک یونان کے علمی ذخیرہ کا بڑا حصہ عربی زبان میں منتقل ہو چکا تھا۔

یونانی فلسفہ و منطق کی تردید میں سب سے پہلے علامہ عبدالکریم شہرستانی (م ۵۴۸ھ) نے ایک کتاب لکھی، جس میں فلسفہ و منطق کی مکمل تردید کی۔ ان کے بعد امام غزالی (م ۵۶۱ھ) نے فلسفہ و منطق کا رد لکھا۔ امام غزالی کے بعد شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے یونانی فلسفہ و منطق کا رد کیا اور فلسفہ و منطق کی تردید میں "نقض المنطق" اور "الرد علی المنطقیین" لکھیں۔ امام ابن تیمیہ نے محض اجمالی تبصرہ اور اصولی اعتراضات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پورے فن پر ایک ناقدانہ اور مجتہدانہ نظر ڈالی اور اس کا علمی احتساب کیا اور خالص فنی حیثیت سے بحث کی۔

علومِ شریعت کی تجدید

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کا سب سے علمی و تجدیدی کارنامہ علوم شرعیہ کی تجدید ہے۔ آپ جس دور میں پیدا ہوئے، اس وقت علوم اسلامیہ بڑی وسعت اختیار کر چکے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ، ہر موضوع پر ایک وسیع کتب خانہ مرتب ہو چکا تھا۔ امام ابن تیمیہ نے ان سب علوم میں عبور حاصل کیا اور اپنی تصنیفات میں پورا فائدہ اٹھایا۔ تفسیر قرآن کو امام ابن تیمیہ نے اپنے فکر کا خاص موضوع بنایا۔ یہ ذوق ان پر اس قدر غالب تھا کہ ان کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں قرآن مجید کی تفسیر کا مواد موجود نہ ہو۔ تفسیر قرآن سے ان کو گہرا تعلق تھا، قرآن مجید سے ان کو بہت شغف تھا اور قرآن سے محبت اور اس کی شرح و تفسیر ان کا امتیازی نشان تھا۔ اسی وجہ سے جب ان کی نماز جنازہ کا اعلان ہوا تو یہی عنوان سامنے رکھا گیا : الصلوٰۃ علیٰ ترجمان القرآن!

امام ابن تیمیہ نے اصول تفسیر پر ایک رسالہ بھی تصنیف فرمایا تھا اور علمائے کرام کی رائے ہے کہ اصول تفسیر پر سب سے پہلا رسالہ یہی ہے۔

حدیث اور اصول حدیث اور شرح حدیث پر آپ کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ ان کے دور میں علم حدیث انتہائی وسعت اختیار کر چکا تھا اور اس وقت یہ ضروری

نہیں سمجھا گیا کہ اس پر مزید کام کیا جائے۔ تاہم امام ابن تیمیہ کی تصانیف میں اصول حدیث' اسماء الرجال' جرح و تعدیل' نقد حدیث اور فقہ حدیث پر بہت مواد ملتا ہے۔ اگر اس مواد کو یکجا جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

اصول فقہ ان کا پسندیدہ اور ذوقی موضوع تھا' جس میں ان کو ملکہ راسخ حاصل تھا اور اس میں وہ مجتہدانہ شان رکھتے تھے۔ ان کی کوئی تصنیف ان اصولی مباحث سے خالی نہیں۔ علم کلام میں بھی ابن تیمیہ تبحر علمی رکھتے تھے اور اس بات کی شہادت ان کی وہ تصنیفات دیتی ہیں جو اس موضوع سے متعلق ہیں۔

فقہ امام ابن تیمیہ کے زمانہ میں اتنی مدون ہو چکی تھی کہ اس میں نیا اضافہ مشکل تھا۔ تاہم امام صاحب نے اس کی طرف خاص توجہ کی۔ آپ نے بکثرت مسائل و احکام پر مجتہدانہ نظر ڈالی۔ فقہ و حدیث میں تطبیق کی کوشش کی۔ نئے پیش آنے والے مسائل کے لئے اجتہاد و استنباط سے کام لیا۔ چنانچہ آپ نے اپنے فتاویٰ و اختیارات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا۔ آپ کے فتاویٰ ۳۴ ضخیم جلدوں میں حکومت سعودیہ نے شائع کر دیئے ہیں۔ اس عظیم علمی کارنامہ کے ساتھ ساتھ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے فکر اسلامی پر جو جمود طاری ہو گیا تھا اس کو دور کیا اور فکر اسلامی کے احیاء کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب و کامران ہوئے۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری سے پہلے تقلید شخصی کا رواج نہیں تھا۔ لوگ کسی ایک عالم یا کسی ایک مذہب کے تعین اور التزام کے بغیر عمل کرتے تھے۔ جہاں تک امام ابن تیمیہ کا تعلق ہے انہوں نے بیشتر مسائل میں امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) کے مذہب و اصول پر فتویٰ دیا ہے۔ اکثر مسائل میں ان کی رائے اور فتویٰ ائمہ اربعہ و ائمہ ہدیٰ میں سے کسی نہ کسی امام کے اجتہاد اور فتویٰ کے مطابق ہے۔ جبکہ بعض مسائل میں انہوں نے اجتہاد سے کام لیا ہے اور کتاب و سنت اور اجماع و قیاس کی روشنی میں فتویٰ دیا ہے۔

امام ابن تیمیہ کے تجدیدی کارناموں پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بہت عمدہ تبصرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

''امام ابن تیمیہ کا یہ تجدیدی کارنامہ ہے کہ انہوں نے جس طرح کتاب و سنت کو عقائد کا ماخذ بنانے کی پرزور دعوت دی اور خود کامیابی کے ساتھ اس پر عمل کیا' اسی طرح کتاب و سنت کو فقہیات و احکام کا ماخذ بنانے اور ان کو حق کا معیار قرار دینے کی طاقت ور دعوت دی اور اپنے زمانہ میں اس پر عمل کر کے دکھایا اور فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ پر عمل کا نمونہ پیش کیا۔ ان کی اس دعوت سے ان فقہی دائروں اور امت کے علمی حلقوں میں جن میں عرصہ سے نئے غور و فکر اور احکام و مسائل کے کتاب و سنت سے مقابلہ کرنے کا کام بند ہو گیا تھا اور اجتہاد و استنباط کا سلسلہ عرصہ سے مسدود تھا' نئی علمی و فکری حرکت اور براہ راست کتاب و سنت کی طرف رجوع کی تحریک پیدا ہوئی۔ اس طرح سے انہوں نے اس صحیح اسلامی فکر کا احیاء کیا جو قرون اولیٰ میں پائی جاتی تھی اور مسلمانوں کی زندگی کی بنیاد تھی۔ اور وہ اپنے ان تمام علمی و عملی کارناموں کی بنا پر تاریخ اسلام کی ان چیدہ شخصیتوں میں سے ہیں' جن سے اللہ تعالیٰ نے اس دین کی تجدید و احیاء کا کام لیا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ''۔

(تاریخ دعوت و عزیمت' ج ۲۷۔ ص ۳۷۵)

تصانیف امام ابن تیمیہ

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے ۱۷ سال کی عمر میں تصنیف و تالیف شروع کی اور ۴۵ سال تک ان کا قلم رواں دواں رہا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی حافظہ سے نوازا تھا۔ دماغ حاضر اور دردمند دل پایا تھا۔ سرعت تحریر کا یہ عالم تھا کہ ایک دن میں ۶۰ صفحات تک لکھ ڈالتے تھے۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ :

''ابن تیمیہ کی تصنیفات..... کئی صدیاں گزر جانے کے بعد اور بڑے اہم علمی و ذہنی انقلابات کے باوجود وہ ابھی تک ایک نئی نسل کے دل و دماغ کو متاثر کرتی ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس عقلیت پسند اور جدت طلب دور میں وہ از سر نو مقبول ہو رہی ہیں۔'' (تاریخ دعوت و عزیمت' ج ۲' ص ۱۵۶)

مشہور اہلحدیث عالم اور محقق مولانا محمد عطاء اللہ حنیف (م ۱۴۰۸ھ) لکھتے ہیں کہ :

''امام صاحب کی تصانیف و تحریرات کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ بعض تصانیف کسی کتاب

کی شرح و تعلیق کی صورت میں مستقل حیثیت رکھتی ہیں یا "قاعدہ" اور "فصل" کے عنوان سے کسی مسئلہ کی تحقیق مستقلاً لکھ ڈالی ہے۔ بعض کتابیں مخالفین اسلام یا مخالف حق فرقوں کی کتابوں کے جواب میں لکھی گئیں۔ بعض مکتوبات و مراسلت کی شکل میں تھیں۔ لیکن عظیم اکثریت سوالوں کے جوابات اور افتاء کی تھیں جن میں تفسیر' اصول تفسیر' حدیث و اصول حدیث' عقائد و کلام بہمہ اقسام تصوف و اخلاق' فقہ و اصول فقہ' وغیرہ مسائل و مباحث شامل ہیں' مختصر سے مختصر بھی اور طویل سے طویل بھی۔" (حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ' ص ۸۰۴)

تصانیف کی تعداد

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف (م ۱۴۰۸ھ) نے امام ابن تیمیہ کی تصانیف کی تعداد ۵۹۱ بتائی ہے اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم نے ۳۸۵ لکھی ہے۔ امام صاحب نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا اس کی تفصیل درج ذیل نقشہ سے دیکھی جاسکتی ہے۔

نمبر شمار	موضوعات	مولانا عطاء اللہ حنیف	غلام جیلانی برق
۱۔	تفسیر	۱۰۲	۸۰
۲۔	احادیث	۴۱	۴۰
۳۔	فقہ و فتاویٰ	۱۳۸	۱۲۰
۴۔	اصول فقہ	۲۸	۲۰
۵۔	عقائد و کلام	۱۲۶	۲۰
۶۔	اخلاق' زہد اور تصوف	۷۸	۶۰
۷۔	تردید فلسفہ و منطق	۱۷	۱۰
۸۔	مکاتیب	۷	۔
۹۔	متفرقات	۵۴	۳۵
	میزان	۵۹۱	۳۸۵

(حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ' مولانا عطاء اللہ حنیف' ص ۷۹۸ تا ۸۳۴۔
امام ابن تیمیہ' از ڈاکٹر غلام جیلانی برق' ص ۱۲۹ تا ۱۵۸)

امام ابن تیمیہ کی مشہور تصانیف

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کی تصانیف کی مکمل فہرست درج کرنا مشکل ہے۔ تاہم چند مشہور تصانیف درج ذیل ہیں۔

تفسیر : مقدمة فی اصول التفسیر - تفسیر آیت کریمہ (لا الٰہ الا انتَ سبحٰنکَ انی کنتُ من الظالمین)

حدیث : شرح حدیث انما الاعمال بالنیات - شرح حدیث لاتسبوا الدھر

فقہ و فتاویٰ : الاختیارات العلمیہ - شرح العمدة

اصول فقہ : منھاج الوصول الیٰ علم الاصول

عقائد و کلام : عقیدة الحمویة الکبریٰ - منھاج السنة النبویة - الجواب الصحیح - الصارم المسلول - اقتضاء الصراط المستقیم - کتاب النبوّات

اخلاق، زہد اور تصوف : الفرقان بین اولیاء الشیطان واولیاء الرحمان

تردید فلسفہ و منطق : کتاب الرد علی المنطقیین

متفرقات : الوصیة الکبریٰ - الوصیة الصغریٰ

نام و نسب و ولادت

احمد نام، عرف ابن تیمیہ، کنیت ابو العباس، لقب تقی الدین - ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ کو حرّان (عراق) میں پیدا ہوئے۔

نقل سکونت

ابتدائی چھ سال حران میں گزارے۔ ساتویں سال میں تھے کہ حران پر تاتاریوں نے حملہ کر دیا تو آپ کے والد عبد الحلیم نقل سکونت کر کے دمشق آ گئے۔

تعلیم و تربیت

دمشق میں امام ابن تیمیہ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اور آپ نے دمشق کے دو مشہور

مدارس دار الحدیث السکریہ اور مدرسہ الحنبلیہ میں تعلیم حاصل کی۔ آپ کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ اس لئے آپ نے تمام علوم اسلامیہ میں ۲۱ سال کی عمر تک کمال حاصل کر لیا۔

ابن تیمیہ کا پہلا درس

۲۲ سال کے تھے کہ آپ کے والد عبد الحلیم ابن تیمیہ نے انتقال کیا' جو اس وقت دار الحدیث السکریہ کے شیخ الحدیث تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ابن تیمیہ شیخ الحدیث مقرر ہوئے اور آپ نے آیت "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پر درس دیا۔ اس درس میں اعیان حکومت کے علاوہ اس وقت کے اساتذۂ فن نے بھی شرکت کی۔ یہ درس کیسا تھا' اس کے بارے میں آپ کے تلمیذ رشید حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں :

> "یہ محیر العقول درس تھا۔ شیخ تاج الدین الفرازی نے اس کے کثیر فوائد اور لوگوں کی عام پسندیدگی کی وجہ سے اس کو اپنے قلم سے ضبط کیا۔ حاضرین نے ابن تیمیہ کی کم عمری اور جوانی کی بنا پر اس درس کی بڑی تعریف کی اور ان کو بہت داد دی۔ اس لئے کہ اس وقت ان کی عمر ۲۲ سال کی تھی۔" (البدایہ والنہایہ ج ۱۳۔ ص ۴۵)

قاضی بننے کی پیشکش

۳۰ سال کے تھے کہ حکومت نے آپ کو قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا مگر آپ نے انکار کر دیا۔ ۶۹۱ھ میں آپ نے حج کیا۔ اور جب حج سے واپس آئے تو تمام ملک میں ان کے علم و فضل کا سکہ جم چکا تھا۔ (مقالات شبلی ج ۵' ص ۶۵)

امام ابن تیمیہ کی پہلی مخالفت

۶۹۸ھ میں آپ کے پاس "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" اور "ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ" جیسی آیات کے بارے ایک استفسار آیا۔ آپ نے اس کا جواب "العقیدۃ الحمویۃ الکبریٰ" کے نام سے لکھا جس میں آپ نے اس مسئلہ کا جواب آثار صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے اقوال کی روشنی میں دیا' مگر علمائے سوء نے آپ کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ قاضی القضاۃ نے آپ کو طلب کیا۔ آپ نے قاضی القضاۃ کے سامنے مسئلہ کی وضاحت قرآن و حدیث کی روشنی میں تفصیل سے

کی۔ اس پر تمام لوگ جو وہاں جمع تھے خاموش ہو گئے اور حالات اعتدال پر آ گئے۔ (البدایہ والنہایہ' ج ۱۴' ص ۴)

تاتاریوں کے خلاف جہاد

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ صاحب قلم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب سیف بھی تھے۔ تاتاریوں کے خلاف جہاد میں امام ابن تیمیہ نے شجاعت و بہادری کے جو جوہر دکھائے' اس کے بارے میں صاحب الکواکب الدریہ کہتے ہیں کہ :

> "امام ابن تیمیہ جب گھوڑے پر سوار ہوتے تھے تو دشمن کی صفوں میں اس طرح گھومتے پھرتے تھے جیسے بڑے سے بڑا بہادر' اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے جیسے بڑے سے بڑا ثابت قدم شہسوار' وہ دشمن کو اپنے حملوں سے چور کرتے رہتے تھے۔ اور اس بے تکلفی سے فوج میں گھس جاتے تھے جیسے ان کو موت کا کوئی ڈر نہیں ہے۔" (الکواکب الدریہ' ص ۱۶۱)

امام ابن تیمیہ کا دور ابتلاء

شیخ الاسلام ابن تیمیہ حق گوئی و بیباکی میں اپنی مثال آپ تھے اور حق کے معاملہ میں کسی قسم کی معمولی سی مداہنت بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس لئے ان کے خلاف ایک طرف صوفیہ سرگرم عمل ہو گئے' دوسری طرف شیعہ بھی ان کے خلاف تھے اور تیسری طرف اہل بدعت بھی آپ کے خلاف مصروف عمل تھے۔ ان سب کی مخالفت اس درجہ بڑھ گئی کہ حکومت کے ایوانوں میں بھی اس مخالفت کے اثرات پہنچ گئے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ کو مصر طلب کیا گیا۔ وہاں آپ سے علماء نے مناظرے کئے' لیکن وہ امام صاحب کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ مگر چونکہ آپ کے مخالفین کا زور زیادہ تھا اس لئے امام صاحب کو جیل میں بند کر دیا گیا اور بعد میں مشروط رہائی کی پیشکش ہوئی۔ لیکن امام صاحب نے اس کو منظور نہ کیا۔ آخر آپ کو رہائی ملی تو ۷۱۲ھ میں واپس دمشق آ گئے۔ ابھی کچھ عرصہ ہی گزارا تھا کہ آپ کو ایک فتویٰ کی بنا پر' جو آپ نے ۷ سال قبل دیا تھا' دوبارہ جیل بھیج دیا گیا۔ یہ فتویٰ "شَدّ الرِّحال" سے متعلق تھا۔ جیل میں آپ نے جتنا وقت بھی گزارا'

وہ آپ نے ذکر و اذکار اور تلاوت قرآن مجید میں گزارا۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے' اس لئے کہ آپ سے قلم دوات چھین لیا گیا تھا۔

وفات

۲۸/ ذی قعدہ ۷۲۸ھ کو ۶۷ سال کی عمر میں دمشق کی جیل میں آپ کا انتقال ہوا۔ جنازہ میں لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ فوج کو کنٹرول کرنا پڑا۔ حاضرین کی تعداد ۲ لاکھ سے متجاوز تھی۔ حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ دمشق کی تاریخ میں اس قسم کے جنازہ کی مثال نہیں ملتی۔ (البدیہ والنہایہ' ج ۱۴' ص ۱۳)

(جاری ہے)

بقیہ : قرآن عزیز کی جلالت شان.:..

سے مغموم کیوں ہو؟ ابراہیم تو جنت کے بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں' آؤ تمہیں دکھاؤں؟---- حضرت ماریہ نے بڑی دانش مندی سے جواب دیا : بس یا رسول اللہ! آپ ؐ کا فرمانا کافی ہے' مجھے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ حضرت ماریہ ؓ کے ایمان بالغیب کا امتحان تھا' جس میں حضرت ماریہ ؓ کامیاب ہوگئیں۔ اگر وہ کہتیں کہ ہاں حضور ؐ دکھایئے! تو یہ بات ان کے ایمان بالغیب کی اہمیت کے خلاف ہوتی۔ محدثین نے لکھا ہے کہ حضرت ماریہ کا بالغیب ایمان' بالشہادہ ایمان کے درجہ پر تھا۔

حاصل بحث یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر باوجود وہبی اور فطری کمالِ نبوت کے مشاہدۂ غیب سے جو تاثر پیدا ہوا وہ ایک امرِ فطری تھا۔ اور جو روایات اس تاثر کو بیان کرتی ہیں وہ نہ خلافِ عقل ہیں اور نہ ساقط الاعتبار۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

سورة البقرة

آیات ۸۴ _ ۸۶

(گزشتہ سے پیوستہ)

ملاحظہ : کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث اربعہ (اللغۃ 'الاعراب 'الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغۃ کیلئے ۱ 'الاعراب کیلئے ۲ 'الرسم کیلئے ۳ 'اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲:۵۲:۲ الإعراب

زیر مطالعہ قطعہ کو نحوی تجزیہ کے لحاظ سے سترہ ۱۷ چھوٹے چھوٹے جملوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے تاہم بعض جملے "و" "ف" یا "ثم" کے ذریعے سے اپنے سے پہلے جملے کا حصہ ہی بنتے ہیں۔ ہم ذیل میں سترہ ہی جملوں کے الگ الگ اعراب بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بتاتے جائیں گے کہ اس کا اپنے سے ماقبل جملے سے کیا تعلق ہے اور یہ کہ تمام جملے کیوں کر ایک ہی مربوط مضمون بناتے ہیں۔

(۱) واذ اخذنا میثاقکم:

اسی جملہ پر اس سے پہلے [۲:۴۱:۲] (الاعراب) میں بات ہو چکی ہے۔

(۲) لا تسفکون دمائکم:

[لا] نافیہ اور [تسفکون] مضارع معروف صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جس میں ضمیر فاعلین "انتم"

مستتر ہے [دماءکم] مرکب اضافی ہے جس میں "دماء" فعل (لاتسفکون) کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے جو آگے مضاف ہونے کے باعث خفیف بھی ہے۔ اس لیے علامتِ نصب آخری ہمزہ (ء) کی فتحہ (ـَ) ہے (جو تنوین نصب کی تخفیف ہے) آخر پر ضمیر مجرور "کم" مضاف الیہ ہے۔ اور یوں دراصل تو یہ پورا مرکب اضافی (دماءکم) مفعول بہ ہے یعنی "تم نہیں بہاؤ گے اپنے خونوں کو"۔ بالمحاورہ تراجم پر حصہ "اللغۃ" میں بات ہو چکی ہے۔

④ ولا تخرجون انفسکم من دیارکم،

[و] عاطفہ ہے جس کے ذریعے بعد کے فعل (لاتخرجون) کو سابقہ صیغہ فعل (لاتسفکون) پر عطف کیا گیا ہے [لاتخرجون] فعل مضارع منفی "بلا" صیغہ جمع مذکر حاضر ہے "لا" کی (دونوں جملوں میں) تکرار کے باعث اردو ترجمہ "اور نہ ہی" سے ہوگا [اَنفُسَکُم] مرکب اضافی ہے جس کا پہلا جزء (مضاف) "اَنفُسَ" فعل "لاتخرجون" کا مفعول بہ ہو کر منصوب ہے اور مضاف ہونے کی وجہ سے خفیف بھی ہو گیا ہے علامتِ نصب "س" کی فتحہ (ـَ) ہے اور ساتھ ضمیر مجرور "کم" مضاف الیہ ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ پورا مرکب اضافی (انفسکم) مفعول بہ ہے۔ [مِنْ] حرف الجر ہے۔ اس کے بعد [دیارکم] بھی مرکب اضافی ہے جس کا پہلا جزء (مضاف) "دیارِ" مِنْ کی وجہ سے مجرور ہے اور یہ بھی آگے مضاف ہونے کی بنا پر خفیف بھی ہے۔ علامتِ جر آخری "ر" کی کسرہ (ـِ) ہے جو تنوین الجر کی تخفیف ہے آخری ضمیر مجرور "کُم" مضاف الیہ ہے اس طرح دراصل تو یہ مرکب اضافی (دیارکم) مجرور بالجر (مِنْ) ہے اگرچہ جرّ کا اثر صرف مضاف میں ظاہر ہوتا ہے اور یہ پورا مرکب جاری (جار مجرور) "من دیارکم" متعلق فعل "لاتخرجون" ہے۔

⑤ ثُمَّ اقرَرْتُم

[ثُمَّ] حرف عطف ہے جس میں ترتیب اور تراخی (کچھ وقت کے بعد) کا مفہوم ہے اور گویا یہاں معطوف علیہ محذوف ہے تقدیر عبارت (مفہوم) یوں ہے "فَقَبِلْتُمْ ثُمَّ"... (پس تم نے" وہ میثاق قبول کیا پھر.....) [اَقرَرْتُمْ] فعل ماضی معروف مع ضمیر الفاعلین "انتم" ہے یعنی "پھر اس کے بعد تم نے اس میثاق کو قبول کرنے کا اقرار کیا"

⑥ وانتم تشھدون:

[و] عاطفہ ہے جو بعد والے جملے کو سابقہ جملے سے ملاتی ہے۔ [انتم] ضمیر مرفوع منفصل یہاں مبتدا ہے اور [تشھدُون] فعل مضارع معروف صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جس میں خود ضمیر فاعلین

"انتم" بھی موجود ہے اور یہ جملہ فعلیہ (تشھدون) "انتم" (مبتدأ) کی خبر ہے چونکہ اس سے پہلے "اقررتم" میں بھی "انتم" تھا (جو تشھدون میں بھی ہے) اس لیے یہاں "انتم" کا مفہوم "تم خود بھی" بنتا ہے گویا مجموعی مفہوم ان دو فقروں (۴ و ۵) کا یہ بنتا ہے کہ تم نے (یعنی تمہارے بڑوں نے) اقرار کیا تھا (میثاق قبول کرنے کا) اور خود تم بھی (اس بات کی) گواہی دیتے ہو (کہ ہاں ایسا ہوا تھا) چنانچہ آیت کے بعض تراجم میں اس مفہوم کے لیے بعض کلمات کے (تفسیری) اضافے کئے گئے ہیں۔

⑥ ثم انتم هٰؤلاءِ تَقتُلُون اَنفُسَكم:

[ثُمَّ] عاطفہ برائے ترتیب وتراخی ہے یعنی "پھر اس کے کچھ عرصہ بعد ہی یہ ہوا کہ" کا مفہوم دیتا ہے [انتم] مبتدأ ہے اور اس کی خبر کے بارے میں نحویوں نے تین چار امکانات بیان کیے ہیں مثلاً (۱) یہ کہ [هٰؤلاءِ] اس کی خبر ہے (تم یہ لوگ ہو) اور اگلی عبارت [تقتلون انفسکم] (جس میں "تقتلون" فعل مضارع صیغہ جمع مذکر حاضر ہے اور "انفسکم" مرکب اضافی اس کا مفعول بہ ہے۔ اسی لیے یہ "انفسکم" منصوب ہے) حال ہو کر محلاً منصوب ہے (یعنی تمہارا حال یہ ہے کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو) (۲) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسم اشارہ "هٰؤلاءِ" یہاں اسم موصول "الذین" کے معنی میں ہو (یعنی تم یہ ہو جو کہ .....) اور (۳) یہ بھی ممکن ہے کہ "هٰؤلاء" سے پہلے ایک مضاف محذوف سمجھا جائے مثلاً "انتم مثلُ هٰؤلاءِ" (تم ان جیسے ہو جو .....) اور (۴) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "انتم" کی خبر "تقتلون انفسکم" ہی ہو اور "هٰؤلاءِ" یہاں "منادیٰ" مفرد ہو یعنی "یاهٰؤلاءِ" (اے یہ (ایسے) لوگو) جو تعجب ظاہر کرتا ہے۔ (۵) بعض نے یہاں "هٰؤلاءِ" کو منصوب "باِضمار الذمّ" مانا ہے (اس میں لفظ سے پہلے "اَذُمُّ" (میں مذمت کرتا ہوں) مقدر (مفہوم) سمجھا جاتا ہے)۔ اردو میں جن حضرات نے "تم وہی ہو/ تم وہی تو ہو" سے ترجمہ کیا ہے یہ اردو محاورے کے لحاظ سے "ذمّ" (مذمت) کا پہلو اپنے اندر رکھتا ہے۔ گویا "وہی" کہنے میں مخاطب کے کسی کرتوت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

⑦ وَتُخرِجُون فريقاً مِنكم مِن دِيارِهم:

[وَ] عاطفہ ہے جس کے ذریعے سے بعد کا جملہ (تخرجون..... دیارھم) سابقہ جملے (تقتلون انفسکم) پر عطف ہے یعنی یہ بھی اسی کی طرح "حال" یا "خبر" قرار دیا جا سکتا ہے [تُخرِجُونَ] فعل مضارع معروف مع ضمیر الفاعلین "انتم" ہے اور [فريقاً] اس (فعل) کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے اسی لیے اس پر تنوین نصب (ـً) آئی ہے [مِنكم] جار مجرور (من+کم) ایک طرح سے "فریقًا" کی صفت کا کام دے رہا ہے ("فریقًا" نکرہ موصوفہ ہے یعنی "ایک ایسا گروہ جو "منکم" (تم میں سے ہی)

ہے) [مِن دیارِھم] میں "مِن" حرف الجرّ ہے "دیار" مجرور بالجر اور آگے مضاف بھی ہے لہٰذا خفیف بھی ہے اور ضمیر مجرور "ھم" مضاف الیہ ہے ۔ اور یہ سارا مرکب جارّی (مِن دیارھم) متعلق فعل (تخرجون) ہے (یعنی نکالتے ہو ان کے گھروں سے)

(۸) تظاھرون علیھم بالاثم والعدوان

[تظاھرون] فعل مضارع معروف صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جس میں ضمیر الفاعلین "انتم" مستتر ہے [علیھم] جار مجرور (علی + ھم) متعلق فعل "تظاھرون" ہے یا یوں کہیے کہ یہاں "علی" توصلہ فعل ہے اور "ھم" دراصل مفعول بہ ہے اس طرح "علیھم" کو یہاں محلاً منصوب بھی کہہ سکتے ہیں [بالاثم] جار (بِ) اور مجرور (الاثم) مل کر (یہ بھی) متعلق فعل (تظاھرون) ہے اور [والعدوانِ] کا "العدوان" بھی "وَ" عاطفہ کے ذریعے "الاثم" پر عطف ہے یعنی "بالاثم وبالعدوان" ۔ یہاں "بِ" سببیہ بھی ہو سکتی ہے (یعنی گناہ اور زیادتی کی وجہ سے ایسا کرتے ہو) اور یہ پورا مرکب جاری (بالاثم والعدوان) حال کے معنی بھی دیتا ہے (یعنی گناہ اور زیادتی کے مرتکب ہوتے ہوئے ایسا کرتے ہو)

(۹) وَاِن یأتُوکم اساری تُفادوھم

[وَ] یہاں مستانفہ ہے جو "اور یہ بھی تو قابل ذکر ہے کہ" کا مفہوم رکھتی ہے [اِنْ] شرطیہ ہے جس کی وجہ سے [یَأتُوکُمْ] کا فعل "یاتوا" مجزوم ہو گیا ہے ۔ علامت جزم آخری "ن" ("یاتون" کا) کا گرنا ہے اور ضمیر منصوب "کم" یہاں فعل (یأتوا) کا مفعول بہ ہے اردو ترجمہ اس کا "کو" سے نہیں کیا جاتا ہے بلکہ "پاس" سے کیا جاتا ہے یعنی "آئیں تمہارے پاس" ۔ [اُساری] یہاں فعل "یاتُوا" کی ضمیر فاعلین (ھم) کا حال (لہٰذا) منصوب ہے مگر اسم مقصور ہونے کے باعث اس میں کوئی ظاہری علامت نصب نہیں ہے ۔ [تُفَادُوھُمْ] میں آخری ضمیر منصوب (ھم) تو مفعول بہ ہے اور اس سے پہلا صیغۂ فعل "تفادوا" مضارع مجزوم ہے اور یہ جواب شرط میں آنے کی وجہ سے مجزوم ہوا ہے علامت جزم آخری "ن" کا گرنا ہے (دراصل تو یہ "تُفَادُون" تھا) یعنی اگر آئیں وہ تمہارے ہاں قیدی ہو کر تو ان کا فدیہ (دے کر چھڑا) دیتے ہو"۔

(۱۰) وھو محرّم علیکم اخراجھم

[وَ] حالیہ ہے اور [ھو] مبتدأ ہے [محرّمٌ] خبر ہے (اسی لیے مرفوع ہے علامت رفع تنوین رفع (ـٌ) ہے [علیکم] جار مجرور (علی + کم) مل کر متعلق خبر (محرّمٌ) ہے ۔ یہاں تک ترجمہ بنا "حالانکہ وہ حرام (کیا گیا) ہے تم پر" [اِخْرَاجُھم] مرکب اضافی ہے ("اخراج" مضاف اور "ھم"

مضاف الیہ) اور یہ سابقہ "مبتدأ (ھو) کا بدل ہے اسی لیے مرفوع ہے علامتِ رفع "ج" کا ضمہ (ُ) ہے کیونکہ یہ لفظ (اِخراجٌ) مضاف ہونے کی وجہ سے خفیف بھی ہو گیا ہے اور بدل "اخراجھم" اس لیے لایا گیا ہے کہ "ھو" سے مراد "تفادی" (چھڑانا) نہ سمجھ لیا جائے۔ گویا مقدر عبارت یوں بنتی ہے" وھو (ای) اخراجھم (ایضاً) محرم علیکم" اور ترجمہ ہو گا "حالانکہ وہ یعنی ان کو نکال دینا (ہی) بھی تو) حرام تھا تم پر" اس کی مختلف بامحاورہ صورتیں حصہ "اللغۃ" میں بیان ہو چکی ہیں۔

⑪ أفتؤمنون ببعض الكتاب وتكفرون ببعض

[أفتؤمنون] کا ابتدائی "أ" استفہامیہ اور "فَ" (فاء) عاطفہ ہے باقی صیغہ فعل "تومنون" مضارع معروف مع ضمیر الفاعلین "انتم" ہے [ببعض الكتاب] کی ابتدائی "بِ" (باء الجر) وہ صلہ ہے جو فعل "آمن" کے ساتھ "پر ایمان لانا" کے معنی کے لیے) لگتا ہے "بعضِ" مجرور بالجر اور آگے مضاف بھی ہے اس لیے اس میں علامت جر "ض" کی کسرہ (ِ) رہ گئی ہے (خفیف ہو کر) اور "الکتاب" مضاف الیہ مجرور ہے [وَ] عاطفہ ہے جس کے ذریعے اگلے فعل [تكفرون] کا (جو مضارع معروف کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے) عطف سابقہ فعل (تومنون) پر ہے [ببعضٍ] دراصل یہ "ببعضِ الکتاب" ہی تھا مگر تکرار سے بچنے کے لیے مضاف الیہ حذف کر دیا گیا تو "مضاف" کو تنوین الجر دے دی گئی (مجرور تو وہ "ب" کی وجہ سے تھا) ایسی تنوین کو تنوینِ عِوَض کہتے ہیں کیونکہ "بعض" تو لفظ ہی ایسا ہے جو ہمیشہ مضاف ہو کر ہی آتا۔ لہٰذا یہ تنوین گویا مضاف الیہ کی جگہ ہے یعنی اس کے عوض ہے۔

⑫ فماجزاء من يفعل ذلك منكم الاّ خزيٌ في الحيوة الدنيا

[فَ] یہاں "الفاء الفصیحۃ" ہے جو کسی شرط کے (بیان ہوئے) بغیر جواب شرط والی "فاء الربط" کی طرح کسی سبب کے نتائج بیان کرنے کا ایک "فصیحانہ انداز" ہے (اسے "فصیحۃ" کہنے کی وجہ یہی ہے) [مَا] نافیہ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ آگے حصر کے لیے "اِلاّ" آرہا ہے اور اگر "مَا" کو استفہامیہ سمجھا جائے تو بھی گویا استفہام انکاری ہی ہے۔ [جزاءُ] مبتدأ (لہٰذا) مرفوع ہے مگر آگے مضاف بھی ہے (یعنی دراصل تو مضاف اور مضاف الیہ مل کر ہی مبتدأ بنے گا) اس لیے اس میں بوجہ تخفیف علامتِ رفع "ءُ" کا ضمہ (ُ) رہ گیا ہے۔ [مَن] اسم موصول مضاف الیہ ہے اس لیے محلاً مجرور ہے یعنی اس میں علامتِ جر ظاہر نہیں ہے (یعنی "بدلہ اس کا جو کہ"...) [يَفعَلُ] فعل مضارع صیغہ واحد مذکر غائب ہے اور یہ اسم موصول (مَن) کا صلہ ہے (بلکہ یوں کہیے کہ یہاں سے صلہ شروع ہوتا ہے) [ذٰلك] اسم اشارہ برائے بعید مذکر ہے اور یہاں یہ "يَفعَلُ" کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے مگر مبنی ہونے

کے باعث اس میں علامتِ نصب ظاہر نہیں ہے [مِنکم] جار مجرور مل کر فعل "یَفعَل" کی ضمیر فاعل (ھو) کی صفت (بیان) یا حال کا کام دے رہا ہے یعنی "تم میں سے ہوتے ہوئے" (یہ کام کرے) گویا مفہوم یہ ہے کہ دعوی ایمان بھی ہے اور کرتوت بھی یہ ہیں۔ اس طرح "من یَفعَل ذٰلك منکم" صلہ موصول مل کر "جزاءُ" کے ساتھ مضاف الیہ ہو کر مبتدا بنتا ہے۔ یعنی "تم میں سے جو یہ کرے اس کا بدلہ" [اِلاّ] حرف استثناء ہے جو یہاں (نفی کے بعد آنے کی وجہ سے) حصر کا کام دے رہا ہے (یعنی "مگر صرف" اور "یہی کہ" کا مفہوم رکھتا ہے) [خِزیٌ] یہ دراصل تو "جزاءُ..." کی خبر مرفوع ہے اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ "کلام غیر تام منفی" کے بعد "اِلاّ" لگنے سے مستثنیٰ مفرغ ہو گیا ہے جس کا اعراب "حسبِ موقع" ہوتا ہے یہاں اگر "ما" نافیہ اور حرف استثناء "اِلاّ" ہٹا دیں تو عبارت رہ جاتی ہے گی "جَزاءُ فلانٍ (من یفعل ذلك منکم) خِزیٌ" اس طرح خبر ہونے کے باعث یہاں مستثنیٰ مفرغ کا اعراب بھی رفع ہی بنتا ہے [فی الحیٰوۃ الدنیا] "فی" حرف الجر ہے اور "الحیٰوۃ الدنیا" مرکب توصیفی ("الحیٰوۃ" موصوف اور "الدنیا" صفت) مجرور ہے اور یہ جار مجرور مل کر "خِزیٌ" (جو نکرہ موصوفہ بھی ہے) کی صفت کا کام دے رہا ہے یعنی "ایسا "خِزیٌ" (رسوائی) جو الحیٰوۃ الدنیا (دنیوی زندگی) میں ہوگا۔"

⑭ وَیومَ القیٰمۃِ یُرَدُّون الی اشدّ العذاب:

[وَ] یہاں برائے استیناف ہے کیونکہ یہاں بلحاظ معنی پچھلی آخری عبارت (فی الحیٰوۃ الدنیا) اور اگلی آنے والی عبارت (یوم القیامۃ) کا باہم عطف نہیں ہو سکتا۔ "الحیٰوۃ الدنیا" والی بات ختم ہوئی اور آگے "یوم القیامہ" والی بات شروع ہوتی ہے۔ یہ بات پہلے بھی کئی دفعہ بیان ہوئی ہے کہ "واو الاستیناف" کا اردو ترجمہ عموماً (واو عاطفہ کی طرح "اور" سے ہی کیا جاتا ہے مگر دراصل اس میں مفہوم "اور یہ بھی قابل ذکر ہے" یا "اور یہ بھی ذہن میں رکھیے" کا ہوتا ہے۔

[یومَ القیامۃ] مرکب اضافی ہے جس میں مضاف "یومَ" ظرف ہونے کے باعث منصوب ہے (اور مضاف ہونے کے باعث "خفیف" بھی ہے) "القیامۃ" مضاف الیہ ("یومَ" کا) ہے اور مجرور (بالاضافہ) ہے اور اس ظرف (یوم القیامۃ) کا تعلق اگلے فعل (یُرَدّون) سے ہے۔ یعنی یہ کام "یوم القیامۃ" کو ہوگا [یُرَدُّون] فعل مضارع مجہول صیغہ جمع مذکر غائب ہے جس میں نائب فاعل "ھم" شامل ہے اس کے بعد [الیٰ اشد العذاب] مرکب جاری ہے جس میں "الی" تو حرف الجر ہے "اشَدّ" صیغہ افعل التفضیل ہے جو مجرور بالجر ہے مگر آگے مضاف بھی ہے اس لیے غیر منصرف ہونے کے باوجود (افعلُ برائے تفضیل غیر منصرف وزن ہے) اسے جرّ کی علامت کسرہ (ــِـ)

دی گئی ہے اس کے بعد "العذاب" مضاف الیہ (لہٰذا) مجرور ہے جس میں علامتِ جر آخری "ب" کی کسرہ (ـِ) ہے۔ یہ مرکب جاری (الیٰ اشد العذاب) بھی متعلق فعل (یردّون) ہے گویا سادہ نثر تو یوں بنتی تھی "ویُرَدُّونَ یومَ القیامۃ الی اشد العذاب)۔ ظرف "یومَ القیامۃ" پہلے لانے سے نہ صرف عبارت میں ایک ادبی (شعر کی قسم کا) حسن پیدا ہوا ہے بلکہ اس میں "قیامت کے دن ہی تو" کا مفہوم پیدا ہوا ہے۔

⑬ وما اللہُ بغافلٍ عما تعملون

بعینہٖ یہی جملہ اس سے پہلے البقرۃ ۷۴ [۲:۴۶:۲] میں گزر چکا ہے۔

⑮ اولٰئک الذین اشتروا الحیوۃ الدنیا بالآخرۃ

[اولٰئک] اسم اشارہ مبتدأ (لہٰذا محلاً مرفوع) ہے [الذین] اسم موصول ہے جو اپنے (آگے آنے والے) صلہ کے ساتھ خبر بنے گا لہٰذا یہاں مرفوع ہے (اولٰئک اور الذین مبنی معنی ہیں اس لیے ان میں کوئی ظاہر اعرابی علامت نہیں ہوتی) [اشتَرَوُا] فعل ماضی معروف صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ [الحیوۃَ الدنیا] مرکب توصیفی ("الحیوۃ" موصوف اور "الدنیا" صفت) ہے اور یہ فعل "اشتروا" کا مفعول بہ ہے اس لیے "الحیوۃ" منصوب ہے اور "الدنیا" صفت اپنے موصوف کے مطابق نصب میں ہے مگر اسم مقصور ہونے کے باعث اس میں ظاہراً کوئی علامتِ نصب نہیں ہے — [بالآخرۃ] جار مجرور (بِ + الاخرۃ) مل کر متعلق فعل "اشتَرَوُا" ہے یا چاہیں تو اسے اس کا مفعول ثانی (جس پر "باء" کا صلہ لگتا ہے) سمجھ لیجئے (اس فعل "اشتری یشتری" کے طریق استعمال پر [۲:۱۲:۱(۱)] میں بات ہوئی تھی)

⑯ فلا یُخَفَّفُ عنھم العذاب

[فلا] کی "فاء" (ف) یہاں بھی عاطفہ بمعنی "فصیحۃ" ہے (دیکھئے اوپر جملہ ۱۲ میں) اور "لا" نافیہ ہے [یُخَفَّفُ] فعل مضارع مجہول صیغہ واحد مذکر غائب ہے [عنھم] جار مجرور مل کر متعلق فعل (یخفّف) ہے جو نائب فاعل سے مقدم (پہلے) آیا ہے [العذاب] نائب فاعل ہے اسی لیے مرفوع ہے۔ سادہ نثر میں یہ عبارت "فلا یخفف العذابُ عنھم" ہوتی ہے جار مجرور کی تقدیم سے عبارت میں ادبی حسن بھی آیا ہے۔ اور مفہوم بھی "ان پر سے ہی تو" کا پیدا ہوتا ہے۔

⑰ ولا ھم یُنصَرُون

بعینہٖ یہی جملہ البقرہ ۴۸ [۲ : ۳۱ : ۲] میں گزر چکا ہے۔ لفظی ترجمہ ہے "اور نہ ہی ان کو مدد دی جائے گی" یعنی کہیں سے مدد بھی نہیں مل سکے گی"۔ یہ جملہ (۱۷) واو عاطفہ کے ذریعے دراصل سابقہ جملے (۱۶) کا ہی حصہ بنتا ہے۔

۳:۵۲: الرسم

زیر مطالعہ قطعہ آیات (البقرہ: ۸۴-۸۶) میں چھ کلمات کا رسم عثمانی متفق علیہ ہے یعنی "تظاھرون، اسارٰی، تفادوھم، الکتاب، الحیاۃ اور القیامۃ" (یہاں ہم نے فرق سمجھانے کے لیے ان تمام کلمات کو رسم املائی کے مطابق لکھا ہے ان کا رسم عثمانی ابھی بیان ہوگا) اور اس قطعہ میں پانچ کلمات (میثاقکم، دیارکم، دیارھم، العدوان اور بغافل) کا رسم عثمانی مختلف فیہ ہے۔ ان کے علاوہ اس عبارت میں چار کلمات (ھؤلاء، ذٰلك، اولئك اور الذین) ایسے ہیں جن کا رسم املائی اور رسم عثمانی یکساں ہے یعنی ان کلمات کی املاء رسم عثمانی کے عربی املاء پر اثرات کا ایک مظہر ہے۔ کلمات کے "رسم" کی الگ الگ تفصیل یوں ہے (جس میں ان کلمات کی آیات زیر مطالعہ میں ترتیب وقوع کو ملحوظ رکھا گیا ہے)

① "میثاقکم" میں کلمہ "میثاق" کا رسم مختلف فیہ ہے "الدانی" کے مطابق یہ "میثاق" (باثبات الف) ہے جب کہ ابن نجاح (ابوداؤد) کے مطابق یہ "میثق" (بحذف الف بعد الثاء) ہے۔ بعض مصاحف (برصغیر وغیرہ) میں یہ باثبات الف (میثاقکم) لکھا جاتا ہے اور بعض ممالک (مصر وغیرہ) کے مصاحف میں یہ بحذف الف (میثقکم) لکھا جاتا ہے نیز دیکھئے [۲ : ۱۹ : ۳] (البقرہ: ۲۷) میں۔

② "دیارکم" کے رسم میں بھی یہی حذف واثبات الف (بعد الیاء) کا اختلاف ہے "الدانی" کے مطابق یہ باثبات الف (دیارکم) لکھا جاتا ہے اور "ابوداؤد" کے قول کو ترجیح دینے والے اسے بحذف الف (بعد الیاء) یعنی بصورت "دیرکم" لکھتے ہیں۔ یہ پہلے کئی دفعہ بیان ہو چکا ہے کہ کون سے ممالک میں "الدانی" کے قول کو ترجیح دی جاتی ہے اور کن ممالک میں "ابوداؤد" کے قول پر عمل کیا جاتا ہے۔

③ "دیارھم" کا اختلاف بھی "دیارکم" کی مانند ہے "الدانی" کے مطابق یہ "دیار" (اثبات الف کے ساتھ) لکھا جاتا ہے اور "ابوداؤد" کی طرف منسوب قول کی بناء پر بعض ممالک (مصر وغیرہ) میں اسے "دیرھم" (بحذف الف بعد الیاء) لکھا جاتا ہے۔

④ "تظاھرون" (یہ اس کا رسم املائی ہے) کے بارے میں تمام علمائے رسم کا اتفاق ہے کہ یہ لفظ قرآن

کریم میں اسی ایک جگہ آیا ہے۔ البتہ اسی (باب تفاعل کے فعل) سے تثنیہ ماضی کا صیغہ "تظاھرا" بھی دو جگہ آیا ہے۔ الدانی اور ابوداؤد دونوں کے نزدیک تینوں جگہ یہ لفظ بحذف الف بعد الظاء لکھا جائے گا یعنی بصورت "تظھرون" اور "تظھرا"۔ چنانچہ تمام ممالک کے مصاحف میں یہ لفظ بحذف الف بعد الظاء ہی لکھے جاتے ہیں اور اگر کہیں ان کو رسم املائی کی طرح باثبات الف لکھا جاتا ہے (مثلاً ایران یا ترکی میں) تو یہ رسم عثمانی کی خلاف ورزی ہے۔

⑤ "العدوان" کا املا قرآنی بھی مختلف فیہ ہے۔ یہ لفظ معرفہ نکرہ مختلف شکلوں میں قرآن کریم کے اندر آٹھ جگہ آیا ہے۔ الدانی کے مطابق یہ ہر جگہ باثبات الالف بعد الواو (یعنی رسم املائی کی طرح) لکھا جاتا ہے۔ جب کہ ابوداؤد سے اس کا "بحذف الالف بعد الواو" یعنی بصورت "العدون" لکھا جانا منقول ہے۔ برصغیر اور لیبیا کے مصاحف میں یہ باثبات الف "العدوان" لکھا جاتا ہے مگر مصر وغیرہ میں بحذف الف "العدون" لکھا جاتا ہے۔

⑥ "اُسارٰی" یہ لفظ بالاتفاق قرآن کریم میں بحذف الالف بعد السین، یعنی بصورت "اسری" لکھا جاتا ہے۔ بلکہ اس صورت (اسری) کے ساتھ یہ لفظ قرآن کریم میں کل تین جگہ وارد ہوا ہے ان میں سے دو جگہ تو یہ پڑھا بھی "اَسْرٰی" ہی جاتا ہے البتہ زیر مطالعہ آیت میں یہ (قراءت حفص کے مطابق) "اُسٰرٰی" (یعنی رسم املائی کے "اُسارٰی" کی طرح) پڑھا جاتا ہے اور اس میں محذوف الف کو ضبط کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے۔

⑦ "تفادوھم" اس کا ابتدائی صیغہ فعل (جو باب مفاعلہ سے فعل مضارع مجزوم کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اس کی جزم کی وجہ "الاعراب" میں بیان ہو چکی ہے) قرآن کریم میں صرف اسی ایک جگہ آیا ہے۔ اور مصحف شریف میں اسے بحذف الالف بعد الفاء یعنی بصورت "تفدوھم" لکھنے پر تمام علمائے رسم کا اتفاق ہے۔

⑧ "الکتاب" یہ لفظ یہاں بحذف الف بعد التاء یعنی بصورت "الکتب" لکھنے پر بھی سب امر رسم کا اتفاق ہے۔ قرآن کریم میں باقی مقامات پر (کیونکہ یہ لفظ قرآن کریم میں بکثرت آیا) اس کے رسم عثمانی کے بارے میں البقرہ: ۲ کے ضمن میں [2:1:3] میں تفصیل سے بات ہوئی تھی۔

⑨ "المحیاۃ" یہ لفظ اس طرح بصورت معرف باللام جہاں جہاں بھی قرآن میں آیا ہے اسے بصورت "الحیوۃ" لکھنے پر اتفاق ہے یعنی اس میں "ی" کے بعد والا الف "بصورت" واو" لکھا جاتا ہے۔ البتہ

اضافت کی صورت میں "الف" ہی لکھا جاتا ہے جیسے "حیاتی" اور "حیاتکم" وغیرہ میں ہے۔

⑩ "القیامۃ" یہ لفظ جو اسی ترکیب (یوم القیامۃ) کے ساتھ قرآن کریم میں ستر دفعہ آیا ہے۔ اس کے متعلق تمام امرِ رسم کا اتفاق ہے کہ یہ ہر جگہ "بحذف الالف بعد الیاء" یعنی ہمیشہ بصورت "القیٰمۃ" لکھا جائے گا یعنی اسے رسم املائی کی طرح باثبات الف لکھنا رسم عثمانی کی خلاف ورزی ہے۔

⑪ "بغافل" یہ لفظ اس طرح (اسم الفاعل "غافل" بصیغہ واحد مذکر) قرآن کریم میں کل دس جگہ آیا ہے اور اس کے رسم عثمانی میں اختلاف ہے "الدانی" کے مطابق اسے باثبات الالف بعد العین لکھا جاتا ہے مگر ابوداؤد سے منسوب قول کی بنا پر اسے بحذف الالف بعد العین یعنی بصورت "غفل" (یعنی "بغفل") لکھا جاتا ہے۔ البتہ اس سے جمع مذکر سالم (غافلون غافلین) اور جمع مؤنث سالم (غافلات) باتفاق بحذف الف بعد الغین لکھے جاتے ہیں (غفلون، غفلین یا غفلت کی طرح) اس قسم کے الفاظ پر مزید بحث اپنے موقع پر آئے گی۔

۴:۵۲:۲ الضبط

زیر مطالعہ آیات کے کلمات کے ضبط میں اختلاف کا تعلق زیادہ تر محذوف الف کو ظاہر کرنے کے طریقے (جس کی ایک خاص صورت "ـٰ" بھی آگئی ہے جسے لیبیا کے مصاحف میں ہمارے ہاں کی کھڑی زبر "ا" کے لیے استعمال کیا جاتا ہے) اور واو ساکنہ ماقبل مضموم کے ضبط سے ہے۔ اگرچہ نون مخفاۃ کے ضبط کا فرق اور بعض زائد حروف پر علامتِ ضبط ڈالنے یا نہ ڈالنے کی صورتیں بھی موجود ہیں۔ بہرحال مندرجہ ذیل نمونوں سے اس اختلاف کو سمجھا جاسکتا ہے۔

وَإِذْ، إِذْ، إِذْ/ أَخَذْنَا، أَخَذْنَا، أَخَذْنَا، أَخَذْنَا/ مِيثَاقَكُمْ، مِيثَاقَكُمْ، مِيثَاقَكُمْ، مِيثَاقَكُمْ/ لَا، لَا، لَا/ تَسْفِكُونَ، تَسْفِكُونَ، تَسْفِكُونَ/ دِمَاءَكُمْ، دِمَاءَكُمْ، دِمَاءَكُمْ/ وَلَا (اوپر گزرا ہے)/ تُخْرِجُونَ، تُخْرِجُونَ، تُخْرِجُونَ/ أَنْفُسَكُمْ، أَنْفُسَكُمْ، أَنْفُسَكُمْ/ مِنْ، مِنْ، مِنْ/ دِيَارِكُمْ، دِيَارِكُمْ، دِيَارِكُمْ،

دِیٰرِکُمْ (بحذف الف)/ ثُمَّ/ اَقْرَرْتُمْ، أَقْرَرْتُمْ، ءَاقْرَرْتُمْ/
وَاَنْتُمْ، اَنْتُمْ، ءَانْتُمْ/ تَشْهَدُوْنَ، تَشْهَدُوْنَ، تَشْهَدُوْنَ/
ثُمَّ اَنْتُمْ (مثل سابق) هٰٓؤُلَآءِ، هٰؤُلَآءِ، هٰٓؤُلَآءِ، هٰٓؤُلَآءِ/
تَقْتُلُوْنَ، تَقْتُلُوْنَ، تَقْتُلُوْنَ/ اَنْفُسَكُمْ (مثل سابق)/
وَتُخْرِجُوْنَ (مثل سابق)/ فَرِيْقًا، فَرِيْقًا، فَرِيْقًا/ مِّنْكُمْ،
مِّنْكُمْ، مِّنْكُمْ/ مِنْ (مثل سابق) دِيَارِهِمْ (سابقہ "دِيَارِكُمْ"
کی طرح)/ تَظٰهَرُوْنَ، تَظٰهَرُوْنَ، تَظٰهَرُوْنَ/
عَلَيْهِمْ، عَلَيْهِمْ/ بِالْاِثْمِ، بِالْاِثْمِ، بِاءِلاثْمِ/ وَالْعُدْوَانِ،
اَلْعُدْوَانِ، اَلْعُدْوٰنِ (بحذف الف) اَلْعُدْوَانِ/ وَاِنْ، اِنْ،
اِنْ/ يَّاْتُوْكُمْ، يَّاْتُوْكُمْ، يَّأْتُوْكُمْ/ اُسٰرٰى، اُسٰرٰى، ءَاسٰرٰى/
تُفٰدُوْهُمْ، تُفٰدُوْهُمْ، تُفٰدُوْهُمْ/ وَهُوَ، هُوَ/ مُحَرَّمٌ،
مُحَرَّمٌ/ عَلَيْكُمْ، عَلَيْكُمْ/ اِخْرَاجُهُمْ، اِخْرَاجُهُمْ،
اءِخْرَاجُهُمْ/ اَفَتُؤْمِنُوْنَ، اَفَتُؤْمِنُوْنَ، ءَافَتُؤْمِنُوْنَ/
بِبَعْضِ/ الْكِتٰبِ، الْكِتٰبِ، الْكِتٰبِ/ وَتَكْفُرُوْنَ،
تَكْفُرُوْنَ، تَكْفُرُوْنَ/ بِبَعْضٍ/ فَمَا، فَمَا، فَمَا/
جَزَآءُ، جَزَآءُ/ مَنْ (مثل سابق)/ يَّفْعَلُ، يَفْعَلُ، يَّفْعَلُ/

ذٰلِكَ، ذٰلِكَ، ذٰلِكَ/ مِنْكُمْ (مثل سابق)، اِلَّا، اِلَّا، اِلَّا، اِلَّا/
خِزْيٌ، خِزْيٌ/ فِي، بِي/ الْحَيٰوةِ، الْحَيٰوةِ، الْحَيٰوةِ/ الدُّنْيَا
الدُّنْيَا، الدُّنْيَا/ وَيَوْمَ، يَوْمَ/ الْقِيٰمَةِ، الْقِيٰمَةِ، الْقِيٰمَةِ/
يُرَدُّوْنَ، يُرَدُّونَ، يُرَدُّوْنَ/ اِلٰى، اِلٰى، اِلٰى/ اَشَدِّ، اَشَدِّ،
اَشَدِّ/ الْعَذَابِ، الْعَذَابِ، الْعَذَابِ/ وَمَا اللّٰهُ، اللّٰهُ،
اللّٰهُ/ بِغَافِلٍ، بِغَافِلٍ/ عَمَّا/ تَعْمَلُوْنَ، تَعْمَلُوْنَ،
تَعْمَلُوْنَ/ اُولٰٓئِكَ، اُوْلٰٓئِكَ، اُوْلٰٓئِكَ/ الَّذِيْنَ،
الَّذِيْنَ، الَّذِيْنَ، الَّذِيْنَ/ اشْتَرَوُا، اشْتَرَوُا، اشْتَرَوُا/
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (مثل سابق)/ بِالْاٰخِرَةِ، بِالْاٰخِرَةِ، بِالْاٰخِرَةِ/
فَلَا، فَلَا، فَلَا/ يُخَفَّفُ، يُخَفَّفُ/ عَنْهُمْ، عَنْهُمْ/
الْعَذَابُ (مثل سابق)، وَلَا، لَا، لَا/ هُمْ، هُمْ/ يُنْصَرُوْنَ،
يُنْصَرُوْنَ، يُنْصَرُوْنَ۔

---

him). Fortunately, our salvation in the Hereafter and our prosperity, honor, and domination in this world are a matter of choice rather than luck.

We have been suffering from the ill effects of our sins for too long. Has the time not yet come for the hearts of the believers to be moved? Or are we waiting for The Punishment to appear right before our eyes?

It's time to think; it is also time to act. **Concluded**

The starting point of collective repentance of a nation is repentance by its individual members. This must include a real feeling of regret, a firm resolve never to repeat the sins, followed by actual change in behavior, and, in the case of any violation of the rights of other human beings, an appropriate compensation or asking for forgiveness from the aggrieved party. This individual repentance, if performed with its true spirit, does guarantee forgiveness from Almighty God in the Hereafter. It does not mean, however, that the individual will escape any collective punishment from God that might befall his nation (Al-Qur'an 8:25), except in the case when he had used all available resources and had tried his utmost to persuade others to give up their sinful practices (Al-Qur'an 7:165).

The state of collective repentance can be achieved only when first of all a considerable number of individuals would repent and mend their ways; then they must unite themselves into a cohesive force and change the general trend of the society by their exhortation and persuasion, their enjoining the good and forbidding the evil, leading to a revolution in thought as well as behavior. And then, in order to change the whole politico-socio-economic setup, a popular resistance movement will be required that would act as a non-political pressure group, forcing the desired transformation through a non-violent revolutionary struggle. At the same time, a strong nucleus of *Iman* or faith has to be created within the educated classes, especially among the intelligentsia, which would act as a center for the revival of faith throughout the whole society, and thus generate intellectual base and popular support for the revolutionary struggle. The establishment of the Islamic System of Social Justice would then represent our collective repentance.

Epilogue

The Messenger of God (Peace be upon him) has prophesied that a time would come when the Muslims, though great in number, would be as weak and ineffective as the scum on the surface of flood waters.

One can hardly doubt that we are living in that age. Our miserable state of existence, as we have seen, is the direct result of our own deeds: Our turning away from the guidance of the Holy Qur'an and the way of Prophet Muhammad (Peace be upon

extremely discouraging — especially in relation to the growing influence of Washington, which has a particular antipathy towards Islamic Fundamentalism — we are still hopeful that our country and the adjoining areas would form, sometime in the very near future, a genuine Islamic State. As for the question "When shall that be?" the following answers can be quoted from the Holy Qur'an:

> They surely take it to be far away, but We see it very near! (70:6,7)

and

> Say: "I do not know if what is promised to you is near, or if my Lord will prolong its term." (72:25)

However, there are two distinct possibilities for our immediate future: Either we will turn towards Allah (SWT) in repentance, in which case the impending punishment shall hopefully be revoked, or we will continue to sink even deeper into sinfulness, in which case — and it is not easy to face these bitter realities — we might suffer a really major disaster, and only then shall we wake up from our slumber. The choice is ours; though, unfortunately, we have so far been opting for the latter.

Aldous Huxley has said that the most important of all the lessons that history has to teach is that men do not learn very much from the lessons of history. The events of the last four thousand years, as narrated very briefly in this book, clearly show how Almighty God punishes His "beloved" people whenever they transgress His commands. In this context, Pakistani Muslims are already feeling the pangs of minor punishments from Allah (SWT), and, unless we repent, a major episode of Divine retribution seems imminent, the signs of which are already in the air. In the words of Jesus Christ, "Already the ax is laid to the roots of the trees; and every tree that fails to produce good fruit is cut and thrown on the fire." (Luke 3:9)

Repentance: The Only Way to Salvation

What needs to be done, therefore, if we are to escape from the impending catastrophe, is that we turn towards Allah (SWT), repent truly, and make a solemn vow to practice Islam in its totality.

New World Order, representing the global designs and interests of United States and Israel. Despite this fact which is apparent to everyone, we are still being so naive that a few known or unknown forces are easily being able misled us into totally meaningless confrontations and violence.

And those who should help stop this madness — our political leaders — are themselves busy fighting for their domination. The dangerously irresponsible and often illogical rhetoric that appears regularly in our national press is ample evidence that they don't care about anything but power. They make lovely promises of prosperity for the common man, but that poor fellow is the last person their list of beneficiaries.

The Impending Doom

Under the prevailing circumstances, therefore, the possibility of an Islamic Revolution in Pakistan in the foreseeable future is almost non-existent. But to give up all hopes would be tantamount to giving in against the forces of disbelief. As a matter of fact, nothing is beyond the power of Almighty God, and it is only on the basis of our reliance on His succor that we are able to keep the hopes of a bright future alive.

Moreover, we also have in our minds a similar phase during the struggle of Prophet Muhammad (Peace be upon him) when, after the death of his only apparent support — his uncle Abu Talib — in the 10th year of Prophethood, the chances of an Islamic Revolution in Arabia appeared thin and bleak. It could have been assumed that the leaders of Quraysh would kill the Prophet and thereby terminate the whole movement. Desperate to find a new base, Prophet Muhammad (Peace be upon him) went to Ta'if, but was violently rejected and there and forced out of the town. Returning to Makkah, he realized that he would be immediately killed upon entering the city, and was therefore forced to ask for the protection of Mut'im bin Adi. The gentleman — who never embraced Islam — arrived at the outskirts of Makkah, and, together with his six armed sons, escorted Prophet Muhammad (Peace be upon him) to the city, announcing his protection. Even after these utterly hopeless conditions, however, the Islamic movement not only survived, but the greatest revolution of all times was achieved in the Arabian peninsula within the next ten years or so.

Thus, even though the present conditions in Pakistan are

identity that became the basis of the idea of Muslim Nationhood was neither racial or linguistic in origin, nor based upon a common homeland, but it was founded upon our unique ideology, viz., our deep affiliation with Islam.

The most crucial purpose behind the idea and struggle for Pakistan was Islamic renaissance and revival. As the ideologue of Pakistan Allama Muhammad Iqbal explained in his famous presidential address at Allahbad, a Muslim state was meant to be "for Islam an opportunity to rid itself of the stamp that Arabian imperialism was forced to give it, to mobilize its law, its education, its culture, and to bring them into closer contact with its own original spirit and with the spirit of modern times."

This means that today we are living in a paradox. Although our country owes its existence to the Islamic ideology, we have so far failed to make any meaningful progress towards the implementation of that ideology. This also means that by refusing to honor our pledge with God the Almighty, we are ourselves responsible for inviting His anger and His retribution. The pathetic state of our affairs is, therefore, nothing but a manifestation of Divine punishment.

At an ideological level, our intelligentsia is almost completely in the favor of liberalism and permissiveness, a point of view based upon the materialistic and atheistic frame of mind which has been imported from the West. Thus, immodesty and licentiousness is being promoted in the name of entertainment and culture as the ideal standards of behavior for our young men and women. Morally, we are probably the worst group of people on the face of the earth. What to speak of Islamic ethics, we are even devoid of basic human values, as lying, cheating, and hypocrisy have become integral parts of our national character.

As for Islam itself, the majority of our uneducated and semi-educated population tend to treat their faith as only a set of dogmas which has nothing to do with a person's value structure. Among the educated classes, most are suffering from various degrees of atheism, skepticism, and agnosticism. A big chunk of our religious community is busy running after wealth and power, and the menace of sectarianism, which is continuously being fueled by them, has added another ominous dimension to the already worsening national chaos.

The only power that stands to benefit from our internal hostilities and schismatic tendencies is, of course, the so-called

> Khurasan (i.e., areas which are now included in Afghanistan and Pakistan), and no force would be able to stop them until they are inserted in Aelia (Jerusalem)."

These prophecies mean that there shall be in the future an Islamic State in the areas which today comprise Afghanistan and Pakistan (and perhaps also those which are included in Iran and Central Asia), so that during the final battles in the Middle East, armies from this part of the world will advance to fight against Dajjal under the leadership of Mahdi. A similar prophecy is also found in the Book of Revelation:

> The sixth angel poured out his bowl on the Great River, the Euphrates; and its water was dried up to prepare a way for the kings from the east (16:12)

The State of our Affairs

We, therefore, tend to believe — on the basis of the above sayings of Prophet Muhammad (Peace be upon him), and also because the revivalist efforts of the last four hundred years have largely been concentrated in the Indian subcontinent — that the process of the global Islamic Revolution is going to start from our part of the world. Despite these high hopes and optimism, however, we must admit that the conditions are extremely depressing and almost totally hopeless at the moment, both in Afghanistan and Pakistan.

As far as our own homeland is concerned, the history of the last half a century is clear proof of the truth that we have done everything in this country except what we were supposed to do in order to promote and substantiate its Islamic ideological character. We have followed every ideology except the one we should have. We have utterly and completely failed to live up to the claims and promises made during the struggle for independence in the 1940's.

During the years just prior to independence, we used to make solemn promises with Allah (SWT) that Pakistan shall represent a true Islamic State. This meant that we had recognized Islam not just as a system of beliefs and individual morality alone, but also as the only sources and criterion for our social, legal, cultural, economic, and political systems. The sense of a separate

reformer appears among the Muslims to clarify and rejuvenate the original teachings of Islam. What is most significant is the fact that, during the first millennium, all of these reformers appeared almost exclusively in the Arab world. After the destruction of Baghdad in 1258, the academic and intellectual center of Islam started to shift eastwards — towards the Indian subcontinent — until, at the start of the second millennium, this part of the world became the main nucleus of Islamic reforms and revivalist movements. Thus, unusually great personalities have appeared here during the last four centuries, including Sheikh Ahmad Sirhindi (11th century Hijra), Shah Waliyullah Delhvi (12th century), Sayyid Ahmad Barelvi (13th century), and more recently, *Sheikh-ul-Hind* Maulana Mehmood Hassan, Allama Muhammad Iqbal, Maulana Muhammad Ilyas, and Maulana Mawdudi (14th century). Now the question arises: Are all these sincere efforts of the last four hundred years to go in vain? We believe the answer is an emphatic NO!

It seems that the burden of Arab Muslims has largely been shifted on to the shoulders of Muslims belonging to the Indian subcontinent, and, especially after the claims and promises made during the movement for independence, the task of reviving Islam as a living force has now become the paramount responsibility of Pakistani Muslims. In view of the efforts undertaken during the last four centuries, this also appear to be their destiny. Last, but by no means the least, are the traditions of Prophet Muhammad (Peace be upon him), which allude to the fact that this part of the world is going to be the starting point for the global Islamic domination; these traditions are given below:

> Ibn Maja has narrated on the authority of Abdullah Ibn Haris, that Prophet Muhammad (Peace be upon him) is reported to have said that during the battles before the Doomsday, "Armies emerging from the East shall advance, and after conquering one country after another, they shall help and strengthen the authority of Mahdi".
>
> According to another tradition narrated by Tirmidhi, on the authority of Abu Huraira, Prophet Muhammad (Peace be upon him) is reported to have said that "Black banners shall emerge from

humiliated group of people. The cause of this unfortunate state of affairs, as we have seen, is our own wrongdoing, our own sinful behavior, our own deviations from the straight path. It follows that the only way to escape from the continuing Divine punishment, and to regain our lost glory, is to repent with the true spirit of repentance and to rectify our corrupted ways.

We the Muslims are the custodians of the last message of Allah (SWT), representatives of the God-given system of life (*Deen-ul-Haq*), and intermediaries between Prophet Muhammad (Peace be upon him) and the entire humanity. This leaves us no way to avoid our primary duty, which is to establish the perfect way of life, viz., Islam and its system of Social Justice, initially in a specific territory and then throughout the entire globe. According to the Holy Qur'an:

> You are the best of community that has been raised up for the (guidance of) humanity; you (are therefore supposed to) enjoin the good, forbid the evil, and keep your own faith firm in God.(3:110)
>
> Strive in the way of God with an endeavor worthy of Him. He has chosen you...in order that the Prophet be a witness against you, and you be witnesses against mankind. (22:78)
>
> Thus We have appointed you a middle people (between the Prophet on one hand and the humanity on the other), so that you be witnesses against mankind, and the Messenger be a witness against you. (2:143)

Although this Herculean but sacred duty of delivering the message of Allah (SWT) to the entire mankind is the collective responsibility of the whole Muslim Ummah, God the Almighty does not burden any soul beyond its capacity, and therefore it is primarily the obligation of Arab Muslims, as the Holy Qur'an was revealed in their own language.

However, after the termination of Prophethood, Allah (SWT) has made a special arrangement to renew and revive the Ummah and her mission. Thus, after every three or four generations, i.e., after about every hundred years or so, a pious

Dr. Ahmed Afzaal

Lessons From History-VIII

Based on the Urdu Columns By: **Dr. Israr Ahmad**

About Jesus Christ (Peace be upon him)

Although the exact nature of the ascension and reappearance of Jesus Christ (Peace be upon him) is incomprehensible to us, and although these events are beyond the realm of normal human experience, they are by no means impossible. The rationalists among us would express serious doubts and lack of conviction about this, but the fact is that our belief in the ascension and reappearance of Jesus Christ is based upon clear verses of the Holy Qur'an and even more explicit traditions of Prophet Muhammad (Peace be upon him). The prevalence of materialistic thinking, especially under the influence of the now outdated Newtonian Physics, has caused many of our intellectuals to reject the possibility of miracles. But it must be kept in mind that a miracle, by definition, represents a breakdown in the usual physical laws of the universe, and a special creative feat of Almighty God is manifested from out of the ruins of that broken law. All natural laws have been established by Allah (SWT), and He is able to suspend any of them for any period of time. He is omnipotent, able to do all things.

It seems, on the basis of the predictions of Prophet Muhammad (Peace be upon him), that both the Jews and the Arab Muslims will become the targets of Divine retribution in the final battles — but with a marked distinction. The condemned Children of Israel are going to be completely destroyed at the hands of their own prophet, Jesus Christ, just as numerous other nations were removed from the face of the earth because they committed the crime of rejecting their respective Messengers. On the other hand, the Muslims will receive their share of punishment for turning away from the Holy Qur'an, and, afterwards, the survivors will be able to repent and mend their ways, paving the way for the beginning of the second phase of the domination of Islam.

From Dishonor to Exaltation

We had started our discussion with the assertion that the Muslim Ummah of today is a pathetic, miserable, and extremely

Quarterly Journal of the Qur'an Academy

The Qur'anic Horizons

Patron: Dr. Israr Ahmad

April-June '96 issue is now available!

Contents

- The Spirit of Revolution (Editorial)
- The Objective and Goal of Muhammad's Prophethood (SAAWS) - II (By Dr. Israr Ahmad)
- The Qur'an and *Riba* (By Dr. Sayyid Tahir)
- Islamic Revolutionary Thought and its Decline (By Dr. Israr Ahmad)
- In Search of Knowledge (By Farhan Shamsi)

Send orders to:

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an Lahore

36-K, Model Town, Lahore-54700